کارل مارکس

علوم اور جدوجہد

تالیف:____________ ڈاکٹر احمد حسین کمال

باراوّل______ یکم مئی 1976

سوانح

انگریزی زبان کے ایک مشہور ادیب اور مورخ ایچ، جی، ویلز (H.G.WELLS) نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ''روس کا انقلاب، اسلام کے ظہور کے بعد سب سے بڑا واقعہ ہے۔ یقیناً روس کا اشترا کی انقلاب عہد حاضر کا اہم ترین اور تاریخ آفریں واقعہ ہے جس سے انسانی تاریخ بے پناہ طور پر متاثر ہوئی ہے یہ انقلاب دفعتاً رونما نہیں ہوا اور نہ اس انقلاب کی حیثیت کسی مقامی اور وقتی انقلاب کی سی ہے بلکہ اس انقلاب کے پیچھے، افکار نظریات کی کشمکش کا صدیوں پر محیط ایک طویل سلسلہ کارفرما تھا اور اس انقلاب کی حیثیت عالمی انقلابات کے ایک نئے سلسلے کے نقطہ آغاز کی تھی۔ روس کے اشترا کی انقلاب کی نظریاتی اساس دراصل کارل مارکس کے اشترا کی افکار ہیں۔ جن کا مفصل اور مستند مجموعہ، مارکس کی کتاب داس کیپیٹل ہے کارل مارکس اور اس کی کتاب داس کیپیٹل کی اہمیت کا اعتراف علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''نیست پیغمبر و لے اندر بغل دارد کتاب''

انیسویں صدی کے آخر میں اس کتاب نے دنیا بھر کے انقلابی ذہنوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور روس کی سرزمین پر انقلابیوں کا ایسا گروہ تیار کر دیا جس نے لینن کی قیادت میں، زار کی شہنشاہیت کا ہی نہیں بلکہ روس کے قدیم سماج کا تانا بانا تک ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ اور کارل مارکس کے اشترا کی

نظریہ پر مبنی، پہلے اشتراکی سماج کی بنیاد کرۂ ارض پر رکھ دی۔

آج اس اہم واقعہ پر نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے اور اس مدت میں روس کے اشتراکی انقلاب کارل مارکس کے اشتراکی نظریات کی گونج اقصائے عالم میں ہر گوشہ تک جا پہنچی ہے۔ نصف کے قریب یورپ اشتراکیت کی آغوش میں آ گیا ہے اور باقی نصف پر تول رہا ہے۔ ایشیا میں چین جیسا کثیر آبادی اور وسیع علاقہ کا ملک اشتراکیت کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ ویت نام کی طویل جنگ اور اشتراکیت پر اس کی فتح نے پورے جنوب ایشیا میں اشتراکیت کے شعلوں کی لپک پھیلا دی ہے۔ آج سرمایہ دارانہ نظام کے حامی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے سب سے بڑا اور اہم مسئلہ خود کو اور اپنے زیر اثر ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ علاقوں کو، اشتراکیت کے فروغ اور غلبہ سے محفوظ رکھنے کی سعی لاحاصل رہ گیا ہے۔ دنیا میں اتنا بڑا انقلاب جس نظریہ بدولت عمل میں آیا وہ مارکس کی کتاب ''داس کیپٹل'' ہی ہے۔ اور آج کا ہر باشعور شخص یہ جاننا چاہتا ہے اور جانان چاہے گا کہ ''داس کیپٹل'' کے مدرجات کیا ہیں جو دنیا میں اتنا بڑا انقلاب جس نظریہ کی بدولت عمل میں آیا وہ مارکس کی کتاب ''داس کیپٹل'' کے مندرجات کیا ہیں جو دنیا میں اتنے بڑے انقلاب کا باعث بنے اور ابھی تک بن رہے ہیں۔ اُردو زبان میں، اشتراکیت کے موضوع اور مارکس کے افکار وخیالات پر چھوٹے موٹے رسائل اور کتابیں، موافق ومخالف حلقوں نے شائع کی ہیں ان میں بیشتر معلق ومبہم ہیں اور بہت سی کتابیں درسائل گمراہ کن حد تک قباحتوں سے پُر ہیں۔ ان سطور کا راقم، اشتراکی ہونے کا دعوے دار نہیں ہے وہ مسلمان سوسائٹی کا ایک فرد ہے اور قرآن وسنت کے باقاعدہ مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اسلام نے دولت مندی کی اور دولت جمع کرنے کے نظام کی سختی کے ساتھ مذمت کی ہے۔ چنانچہ اسلام کے اس مطالعہ نے ہی مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ عہد حاضر ظالم ترین سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عصر حاضر کی سب سے بلند آواز اشتراکی انقلاب کا بھی مطالعہ کروں اور کارل مارکس کی کتاب داس کیپٹل کے مندرجات کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ آئندہ اوراق میں داس کیپٹل کے اس مطالعہ کا حاصل ہی میں نے پیش کیا ہے۔ یہ کیپٹل کا لفظی اور تفصیلی ترجمہ تو نہیں ہے لیکن ایسی تلخیص ضرور ہے جس میں کیپٹل کے اصل موضوعات کو سادہ اور سہل زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔

امید ہے کہ اس تلخیص کے مطالعہ اردو بان کے قارئین کیپٹل کے مندرجات اور سوشلزم وکمیونزم کی

مبادیات سے صحیح طور پر واقف ہو جائیں گے اور مخالف وموافق دونوں کو اس بارے میں ٹھیک ٹھیک رائے قائم کرنے کا موقعہ مل سکے گا۔ مارکس کے نظریات کو صحیح طور پر جاننے کے لیے ضروری ہے کہ مارکس کی زندگی اور اس کے پیش کردہ سوشلسٹ نظریات کے سلسلہ میں اس کے ذہنی ارتقاء کا سوانحی مطالعہ کیا جائے۔

چنانچہ میں اس تحریر کا آغاز مارکس کی سوانح اور ارتقاء افکار کے مختصر تذکرہ سے کر رہا ہوں۔

حالاتِ زندگی

شہر لندن کے شمال میں، ایک پہاڑی کے اوپر گیٹ نامی قبرستان میں چند قبریں ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ان قبروں میں سے ایک پر مندرجہ ذیل کتبہ لگا ہوا ہے۔

کارل مارکس (KARL MARX)

ولادت 5 مئی 1818، وفات 14 مارچ 1883

کارل مارکس کی قبر کے دائیں، بائیں، اس کی بیوی جینی۔ان دونوں کا نواسہ ہیری لونگ وے اور ان کے گھر کی ایک دیرینہ مددگار خاتون ہیں دی متھ کی قبریں بھی بنی ہوئی ہیں۔

خاندان:۔کارل مارکس، جرمنی کے علاقہ رائین لینڈ RHINE LAND کے ایک مقام ”تری دیس“ میں ایک قانون دان کے گھر پیدا ہوا۔کارل مارکس کا دادا ایک یہودی کاہن تھا کارل مارکس کے خاندان نے 1824 میں جب کہ کارل مارکس کی عمر 6 سال کی تھی عیسائیت اختیار کرلی تھی۔

تعلیم:۔کارل مارکس کی ابتدائی تعلیم ٹری دیس (TREVES) میں ہی ہوئی سترہ سال کی عمر میں، بون (جرمنی) یونیورسٹی سے کارل مارکس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اور اس یونیورسٹی میں اس نے قانون کے شعبہ میں داخلہ لے لیا۔ایک سال بعد، برلن (جرمنی) یونیورسٹی میں اسے داخلہ مل گیا۔ یہاں اس نے قانون کے علاوہ تاریخ فلسفہ ادب آرٹ اور لٹریچر کا بھی مطالعہ شروع کردیا۔

ہیگل سے اثر پذیری:۔ 1837 میں کارل مارکس کانٹ (KANT) اور نٹشے

(Nietzsche)کے تصوراتی فلسفیانہ افکار سے اکتا کر ہیگل (HEGEL) کے منطقی خیالات کی طرف متوجہ ہوا۔ ہیگل کو پڑھنے سے پہلے کارل مارکس، ناولوں کہانیوں اور نظموں سے اچھا خاصا لگاؤ رکھتا تھا اور مستقبل کے لئے اس کا پروگرام ''ادبی مشاغل'' کا ہی تھا لیکن ہیگل کے افکار سے متاثر ہو کر اس نے وہ تمام ذخیرہ جلا کر خاک کر دیا جسے اس نے آئندہ کے اپنے ''ادبی مشاغل'' کے لیے جمع کیا تھا۔

فکر قدیم سے فکر جدید کی طرف

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر تک اکثر ''مفکرین'' یہ سمجھتے اور سمجھاتے چلے آ رہے تھے کہ کائنات ایک غیر متغیر ابدی چیز ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز سے کائنات کے بارے میں حرکت و تغیر اور ارتقا کا نظریہ ابھرنا شروع ہوا۔ اس نظریہ کے لیے انسانی فکر نے ایک نئی منطق کا سہارا ڈھونڈنا چاہا۔

ہیگل کے افکار:۔ ہیگل (1770 تا 1831) کے افکار، دراصل اس تلاش کا ہی حاصل ہیں۔ ہیگل نے نظریہ اضدادیت CONTRADIICTIONS فلسفہ منطقی شکل میں، علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مارکس نے اس فلسفہ اور منطق کا مطالعہ پوری گہرائی سے کیا اور عرصہ تک ہیگل کے فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے میں لگا رہا۔

باپ کا اظہارِ تشویش:۔ دوسرے لڑکے رات بھر آرام سے سوتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا لائق بیٹا تمام تمام رات خشک فلسفیانہ مضامین پڑھتے ہوئے آنکھوں میں گزار دیتا ہے۔ ان معمولی قسم کے لوگوں کو دیکھو، کتنی آسانی کے ساتھ وہ اپنا سفر طے کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں جب کہ تم جیسے لوگ علم و صداقت کی تلاش میں اپنی صحت تک تباہ کر لیتے ہیں۔ کاش تم بھی شب بیداری اور تنہائی چھوڑ کر آرام کے ساتھ کچھ وقت گزار کرو''۔

تعلیم کی تکمیل:۔ کارل مارکس نے ''اپی کیورس اور ڈیموکریٹس'' کے افکار پر ایک مقالہ لکھ کر 1841 میں ''پی ایچ ڈی'' کی ڈگری حاصل کی۔ کارل مارکس نے کوشش کہ یونیورسٹی میں اسے ''لیکچرر

شپ'' مل جائے لیکن زمانہ طالب علمی میں ہی اس کی آزادخیالی اور صاف گوئی کا اتنا چرچا پھیل گیا تھا کہ کوئی یونیورسٹی اسے اپنے یہاں جگہ دینے پر آمادہ نہیں ہوئی۔

صحافت:۔ بالآخر اسے ''صحافت'' کی طرف مائل ہونا پڑا۔ اور اس میدان میں اس نے اپنے ذہنی جوہر آزمانا شروع کردئے۔ اس نے اپنی نگارشات میں ہیگل کی منطق کا حربہ اختیار کیا اور بے رحمانہ تنقید کے ذریعے پوری سماج کے ایک ایک عضو کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس دوران اس نے اقتصادیات کے مطالعہ پر بھی اپنی توجہ مبذول کی۔

ایڈیٹر:۔ اکتوبر 1842 میں وہ ''رائین گزٹ'' کا ایڈیٹر مقرر ہوگیا۔ مارکس کے مضامین حکومت وقت کے لیے وجہ تشویش بننے لگے۔ حکومت نے اخبار کی پالیسی بدلنے کا مطالعہ کیا بصورت دیگر اخبار بند کردینے کی دھمکی دے دی اخبار کے مالکوں نے حکومت کے خوف سے اخبار کی پالیسی ڈالنے کا ارادہ کرلیا اور مارکس نے اخبار کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے باوجود حکومت وقت نے اخبار ضبط کرلیا۔

شادی:۔ اسی زمانہ میں مارکس کی شادی لڈوگ فان دیسٹ فالین کی لڑکی جینی، سے ہوگئی۔ ''جینی'' عمر میں مارکس سے 4 سال بڑی تھی۔ اس کے والد ''لڈوگ'' پریوی کونسل کے ممبر تھے۔ مارکس نے بچپن میں اپنی ابتدائی تعلیم کا زمانہ لڈوگ کے گھر پر گزارا تھا۔

بچپن ہی سے مارکس اور جینی ایک دوسرے سے شناسا اور ایک دوسرے کی طرف مائل تھے۔ جینی کی تربیت علمی اور تہذیبی ماحول ہوئی تھی۔ اس میں صبر وقناعت اور برداشت وحوصلہ مندی کے اوصاف شروع سے موجود تھے۔ مارکس نے زمانہ طالب علمی میں جینی کی چاہت سے سرشار ہوکر بڑی ہی جذبات انگیز پاکیزہ نظمیں کہی تھیں۔ اور ان نظموں کو بطور ''ہدیہ محبت'' اپنی بہن ''صوفیہ'' کی معرفت جینی کے حضور بھیجا تھا۔ صوفیہ نے مارکس کو اطلاع دی تھی کہ جینی نے یہ ہدیہ خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ قبول کرلیا ہے۔ مارکس اس اعتبار سے بڑا خوش نصیب نکلا کہ اسے جینی کی صورت میں ایسی رفیقہ حیات مل گئی جس نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک مارکس کے انقلابی افکار وکردار کو ابھرنے اور عام ہونے کا بھرپور موقعہ مہیا کیا۔

اقتصادیات کا مطالعہ:۔ مارکس اخبار کی ایڈیٹری سے علیحدہ ہوا تو اس نے اپنا پورا وقت ''اقتصادیات'' کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا۔ دو سال تک وہ اس مطالعہ میں مصروف رہا چنانچہ اقتصادیات کے اس مطالعہ کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ سوشلزم کی طرف مائل ہوا ورنہ اس سے قبل وہ محض ایک لبرل یعنی ترقی پسند آزاد و خیالات کا آدمی تھا۔

مارکس نے اپنی کتاب تنقیدِ معاشیات A Critique of Political Economy میں ایک جگہ لکھا ہے۔

43۔1942 میں جب میں رائین گزٹ کا ایڈیٹر تھا میں نے محسوس کیا کہ میں مالی معاملات پر بحث کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں۔ رائین صوبہ کی مجلس قانون ساز میں اس وقت آزاد تجارت، تجارتی تحفظات اور کسانوں کے معاملات جیسے مسائل پر بحثیں ہو رہی تھیں۔ ان بحثوں نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں اقتصادی مسائل کا بھرپور مطالعہ کروں۔ رائین گزٹ مین سوشلزم اور کمیونزم کے موضوع پر بھی مضامین شائع ہوتے رہتے تھے لیکن مجھے یہ سطحی خیالات معلوم ہوتے تھے اور اس قسم کے مضامین کو میں پسند نہیں کرتا۔ تاہم میں سمجھتا تھا کہ اس موضوع پر میرا مطالعہ کافی نہیں ہے۔

افکار نو کا احساس:۔ لیکن اقتصادیات کا مسلسل دو سال مطالعہ کرنے کے بعد مارکس اس قابل ہو گیا کہ جب اس نے 1844 میں ''ہیگل کا فلسفہ قانون'' نامی کتاب مرتب کی۔ تو اس میں واضح طور پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''جب پرولتاری طبقہ۔ اشیا کے موجودہ شیرازہ کو بکھیرنے کا اعلان کرتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی اور اپنے وجود کا ادراک حاصل کر لیا ہے اور اسے یہ بصیرت مل گئی ہے کہ موجودہ سرمایہ نظام کی تباہی اس کے ہاتھوں مقدر ہے۔''

پیرس میں آمد:۔ شادی کے بعد کارل مارکس اپنی اہلیہ کو لے کر پیرس چلا آیا۔ پیرس میں اس نے ایک جرمن، فرانسیسی، سالنامہ کی ادارت قبول کر لی۔ اس سالنامہ کا پہلا شمارہ 1845 میں نکلا۔

اینگلز:۔ سالنامہ کے اس پہلے نمبر میں، مارکس اور دوسرے صاحبان قلم کے علاوہ، ایک مقالہ،

اینگلز(ENGELS)نامی ایک نوجوان کا بھی تھا۔

اس مقالہ میں اینگلز نے رائج الوقت اقتصادی نظام کی سخت مذمت کی ہے اور ساتھ ہی خیال پرست(UTOPIAN)سوشلسٹوں کے ''اقتصادی حل'' سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔

مارکس اور اینگلز کی دوستی

اینگلز کے اس مقالہ نے مارکس کو بہت متاثر کیا اور یہاں سے ان دونوں کے درمیان ایسی ہم خیالی اور دوستی کی ابتدائی ہوئی جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملے گی۔

اینگلز کی مختصر سوانح:۔اینگلز جرمنی کے اسی علاقہ میں پیدا ہوا۔(برمین BREMEN) جہاں کارل مارکس پیدا ہوا تھا۔اینگلز کی تاریخ پیدائش 28 نومبر 1820 ہے۔اینگلز کا باپ صاحب حیثیت شخص تھا اور ایک فیکٹری کا مالک تھا۔اینگلز نے مقامی ہائی اسکول میں ابتدائی تعلیم مکمل کی اور پھر (البرفیلڈ)(ALBERFIELD) کی اعلیٰ تعلیم گاہ میں اس نے داخلہ حاصل کرلیا۔لیکن اس کے والد نے، اپنے کاروبار میں معاونت کے لیے آخری امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی اسے واپس بلا لیا۔ 1841 میں اینگلز کو لازمی فوجی بھرتی کے قانون کے تحت توپ خانہ میں کام کرنا پڑا اور اس طرح اسے فوجی معاملات کو سمجھنے میں مہارت حاصل ہوگئی۔فوجی تربیت سے فارغ ہوکر، وہ ایک کپڑے کے کارخانے سے وابستہ ہوگیا اور اس کارخانہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے اس کا تقرر، مانچسٹر(انگلستان کا ایک صنعتی شہر)میں ہوا۔

اینگلز کی سرگرمیاں:۔انگلستان آکر اینگلز نے یہاں کی مختلف عوامی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔چارٹسٹ تحریک اور ٹریڈ یونین تحریک میں وہ پوری طور پر شامل رہا۔1844 میں اس نے اپنی مشہور کتاب ''انگلستان کے مزدور طبقہ کی حالت'' لکھی۔انگلستان سے واپسی کے بعد کارل مارکس اور اینگلز ایک دوسرے کے بہت قریبی دوست بن گئے۔اس وقت کی یادگار، دونوں کی ایک مشترکہ تصنیف جس کا نام، ہولی فیملی(HOLY FAMILY)ہے۔

یک جائی:۔1845 میں اینگلز نے تجارتی کاروبار کو بالکل خیر باد کہہ دیا۔اور برسلز میں کارل مارکس کے پاس ہی آ گیا۔ دوسال تک دونوں دوست اکٹھے رہے اور تحقیق، تصنیف اور تنظیم کے کاموں میں ایک دوسرے کے رفیق رہے۔

1847 میں اینگلز،فرانسیسی مزدوروں کے نمائندہ کی حیثیت سے لندن آیا۔اور اسی دوران کارل مارکس بھی مستقبل سکونت کے لیے وہاں آ گیا۔1848-1849 اور 1850 کے سالوں میں ان دونوں دوستوں نے باہمی رفاقت میں رہ کر انقلابی سرگرمیوں کے محاذ، یورپ، امریکہ اور ایشیا کے کئی ملکوں میں قائم کر دیئے۔

اسی دوران دونوں دوستوں نے مل کر مشہور زمانہ ''کمیونسٹ مینی فسٹو'' مرتب کیا۔

اینگلز کا بے مثال ایثار:۔1850 میں اینگلز نے دوبارہ تجارت کے میدان میں قدم رکھا مگر صرف اس لیے کہ وہ اتنا کما سکے جس کے ذریعہ اس کا دوست مارکس معاشی فکر سے آزاد رہ کر تحقیق و تالیف کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔اس فیصلہ کے بعد اینگلز، بیس سال تک، مارکس سے دور رہا تاہم یہ دوری محض جسمانی فاصلوں کی تھی ورنہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ برابر تبادلہ افکار کرتے رہتے۔ایک دوسرے کو ہر روز خط لکھتے رہتے تھے۔ یہ خطوط ایک ضخیم جلد کی صورت میں آج موجود ہیں اور انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے۔کہ بیس سال کی پوری مدت ان صفحات میں سمٹ آئی ہے۔ان بیس سالوں میں ہونے والے تمام اہم واقعات پر دونوں دوستوں کی آراء ان خطوط میں بھرپور طریقہ پر موجود ہیں۔فرانس کا کمیون انقلاب، 1857 کی جنگ آزادی، یورپ کی سیاسی کشیدگیاں، امریکہ کے سیاسی تغیرات افریقہ اور ایشیا میں سامراجی طاقتوں کا داخلہ وغیرہ وغیرہ تمام اہم واقعات پر ان خطوط میں تبصرے موجود ہیں۔

مزید برآں، متعدد علمی، فنی مسائل پر دونوں دوستوں نے کھل کر ایک دوسرے کو لکھا ہے۔دراصل اینگلز کی مخلصانہ دوستی نے کارل مارکس کے جسم و دماغ اور قلم کو زندہ رکھنے اور کارآمد بنانے میں ایک زبردست تاریخی کردار انجام دیا۔اور اینگلز کے اس ایثار کی بدولت ہی کارل مارکس اپنی مشہور زمانہ کتاب ''کیپٹل''، تکمیل کر سکا۔

کارل مارکس کا اعتراف:۔ مارکس نے خود ایک خط میں تہ دل کے ساتھ اس حقیقت

کا اعتراف کیا ہے۔

''یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں تمہاری مدد کے بغیر اپنی اس محنت (داس کیپیٹل) کو تکمیل تک پہنچا سکتا لیکن میں ہمیشہ اس خیال سے گراں خاطر رہا ہوں کہ تم نے بہتریں قابلیت کو صرف میری وجہ سے بیکار رکھا اور صرف میرے لئے تم نے تجارت کا مشغلہ اختیار کر کے اپنی ذہانت کو زنگ آلود ہو جانے کی اجازت دی''۔ اینگلز سالہا سال تک ساڑھے تین سو پونڈ سالانہ مارکس کو بھیجتا رہا۔

اینگلز کی لندن واپسی:۔ 1870 میں اینگلز، لندن واپس آیا۔ اور اس کے بعد مارکس کے آخری وقت تک وہ لندن میں مقیم رہا۔

اینگلز کی وفات:۔ اینگلز کی وفات 6 اگست 1895 میں ہوئی۔

تصنیفات:۔ اینگلز نے اپنے بعد اچھا خاصا علمی ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اس کی درج ذیل تصنیفات نہایت اہم اور دقیع سمجھی جاتی ہیں۔

۱۔ خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کی ابتداء

(ORIGIN OF FAMILY, PRIYATE PROPERTY AND STATE)

۲۔ یوٹوپین سائنس کے درجہ تک سوشلزم کا ارتقاء

(SOCIALISM, UTOPIAN AND SCIENTIFIC)

۳۔ ''دوہرنگ'' کا رد

(ANTI DUHRIGN)

۴۔ انگلستان کے مزدور طبقہ کی حالت

(CONDITION OF THE WORKING CLASS IN ENGLAND)

۵۔ اضداد فطرت

(DIALECTIES OF NATURE)

تاریخ کا مادی تصور اور تاریخی جدوجہد

گزشتہ اوراق میں کسی جگہ، مارکس اور اینگلز کی ایک مشترکہ تصنیف ہولی فیملی (HOLY FAMILY) کا ذکر آیا ہے۔ یہ کتاب 1844 میں لکھی گئی تھی۔ مارکس اور اینگلز نے اس کتاب میں پہلی مرتبہ تاریخ کے ''مادی تصور'' اور طبقاتی جدوجہد کا تصور پیش کیا ہے۔ ''ہم کسی بھی دور کو اس دور کے ذرائع پیداوار کا مطالعہ کئے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ صرف وہ افکار ہی معاشرہ کی تشکیل کی صلاحیت طاقت رکھتے ہیں۔ جن میں مفاد عامہ کی ترجمانی موجود ہو اس کے ماسوا خیالات سے صرف شورش انگیزیاں ہی جنم لیتی ہیں۔''

ہولی فیملی کا یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ مارکس اور اینگلز نے تاریخ کو ایک نئے نقطۂ نظر سے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ بعد میں علامہ اقبال نے اس خیال کی یوں ترجمانی کی۔

''جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا''

مارکس کا پیرس سے اخراج

پیرس کے قیام کے دوران، مارکس کے تعلقات بہت سے انقلابیوں سے قائم ہو گئے۔ ان میں مشہور سوشلسٹ مفکر پرودھون اور جرمن شاعر ''ھائنے'' قابل ذکر ہیں۔ مارکس ''پیرس فارورڈ'' نامی ایک اخبار میں بھی مضامین لکھا کرتا تھا یہ اخبار جمہوریت کا ترجمان تھا۔ مارکس اپنے مضامین میں، جرمنی کی خود سر حکومت پر شدید تنقید یں کرتا اور جرمن عوام کو جمہوریت کی خاطر سرگرم ہونے کی تلقین کرتا رہتا۔ جرمن حکومت نے ایسی تحریروں سے برافروختہ ہو کر فرانس کی حکومت پر زور ڈالا اور مارکس کو فرانس سے نکلوا دیا۔

برسلز (بلجیم ک ایک شہر) میں قیام

پیرس سے جلاوطن ہو کر مارکس، بروسلز چلا آیا۔ اور اس نے، جرمن حکومت کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاجاً اپنے جرمن شہریت کے حقوق، ترک کر دیے۔

بروسلز کے قیام کے دوران ہی مارکس نے اپنی مشہور تنقیدی کتاب ''افلاس فلسفہ'' لکھی۔ یہ کتاب پرودھون کی کتاب ''فلسفہ افلاس'' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ پرودھون نے اپنی اس کتاب میں سوشلزم کے نام سے انارکزم کی حمایت کی ہے اور اسے فلسفیانہ رنگ میں افلاس کے خاتمہ کی واحد تدبیر کے طور پر پیش کیا ہے۔ مارکس نے پرودھون کے اس خیال کی شدت کے ساتھ تردید کی اور اس طرح کی فکر کو فلسفہ کا افلاس قرار دیا۔

جسٹس لیگ:۔ جرمنی سے نکالے ہوئے لوگوں کی ایک بڑی تعداد، پیرس میں مقیم تھی۔ ان لوگوں نے اپنی ایک تنظیم بھی بنا رکھی تھی اس میں ہر قسم کے جلاوطن اور جرمن سے آئے ہوئے لوگ شامل تھے۔ 1836 میں اس تنظیم سے مزدور پیشہ اور انتہا پسند سیاسی ذہن کے لوگ علیحدہ ہو گئے ان سب نے ''لیگ آف جسٹس'' کے نام سے اپنی ایک خفیہ تنظیم بنائی اور جلد ہی یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں اس لیگ کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ حتیٰ کہ 1840 میں اس لیگ کی سرگرمیاں لندن تک پہنچ گئیں۔ اور ''جرمن مزدوروں کی تعلیمی انجمن'' کے نام سے لندن میں اس تنظیم کا دفتر قائم ہو گیا۔

خفیہ تنظم میں شمولیت سے مارکس کا انکار

1843 میں اس لیگ کی طرف سے مارکس کو شمولیت کی دعوت ملی۔ لیکن اس نے اس دعوت کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ خفیہ کارروائیوں اور دہشت انگیز سرگرمیوں کا قابل نہیں ہے۔ تاہم لیگ کے ارکان برابر کوشاں رہے۔ کہ مارکس اور اینگلز کو کسی نہ کسی صورت لیگ میں شامل کیا جائے اور وہ مرکزی کمیٹی پر برابر زور ڈالتے رہے۔ بالآخر 1847 میں جسٹس لیگ کی مرکزی کمیٹی کا ایک نمائندہ جس کا نام (MOLL) تھا بروسلز پہنچ کر مارکس سے ملا اور پیرس جا کر اینگلز سے ملا۔

مارکس اور اینگلز کی شمولیت

مول نے واضح کیا کہ جسٹس لیگ، مارکس کے نظریات اور پروگرام کو اختیار کرنے پر آمادہ ہے۔ چنانچہ مول کی دعوت پر دونوں (مارکس اور اینگلز) لیگ آف جسٹس میں شامل ہو گئے۔

کمیونسٹ لیگ کی تشکیل

1847 میں لیگ کی پہلی کانگریس، لندن میں منعقد ہوئی۔ بروسلز شاخ کی طرف سے مارکس نے اپنے رفیق کار ''دولف (WOLF) کو بھیجا اور پیرس شاخ کی طرف سے اینگلز نے کانگریس میں شرکت کی۔ اس کانگریس میں لیگ کو از سرنو منظم کرنیکا منصوبہ تیار کیا گیا۔ خفیہ کارگزاریوں اور دہشت انگیز کارروائیوں کو، لیگ کے پروگرام سے خارج کر دیا گیا اور اب اس کا اعلانیہ نام ''کمیونسٹ لیگ'' رکھ دیا گیا۔

نعرے اور مقصد:۔ کمیونسٹ لیگ نے دنیا بھر کے عوام کو مندرجہ ذیل تین نعرے دیے۔

(۱) سرمایہ داری کا خاتمہ (۲) مزدور حکومتوں کا قیام (۳) دنیا بھر کے عوام کو مزدوروں کا اتحاد۔

اپنے پروگرام کمیونسٹ لیگ نے واضح کر دیا کہ اس لیگ کا مقصد ایک ایسے معاشرے (سماج) کی تشکیل ہے جس میں طبقاتی امتیاز موجود نہ ہو۔ ایسا سماج، سرمایہ داری کے مکمل خاتمہ کے بعد ہی وجود میں آسکتی ہے۔ اور سرمایہ داری کا خاتمہ مزدوروں کے اتحاد ہی سے ممکن ہوسکتا ہے''۔

کمیونسٹ منشور:۔ لیگ کا دوسرا اجلاس جلد ہی 23 دسمبر 1847 میں منعقد ہوا مارکس نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ دس دن تک اجلاس کی کارروائی ہوتی رہی۔ اجلاس میں طے کیا گیا کہ مارکس اور اینگلز، کمیونسٹ لیگ اغراض ومقاصد تحریر کریں۔

چنانچہ دونوں نے ایک ''منشور'' مرتب کیا۔ یہ منشور، فروری 1848 کے انقلاب فرانس سے چند ہفتے قبل طباعت کے لیے دیا گیا تھا۔ یہ ہی وہ مشہور عالم کمیونسٹ مینی فسٹو ہے جس نے دنیا میں کمیونسٹ انقلاب کی بنیاد رکھی۔ اور دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں کا لائحہ عمل بنا۔

اس منشور کے تحریری اسلوب میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اب تک کسی بھی ایسی دستاویز میں نہیں پائی گئیں۔

(۱) نہایت عام فہم ہے۔ (۲) جدلیاتی طرز تحریر کا مکمل نمونہ ہے۔ (۳) اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے منفرد تحریر ہے۔ (۴) یہ پہلی دستاویز ہے جس میں مزدور طبقہ کی حکومت کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ اس تحریر میں پہلی مرتبہ انسانی تاریخ کے تمام مراحل کو غریب طبقہ کے مفاد میں مرتب کیا گیا ہے۔ نیز

(۵) غریبوں اور مزدوروں کی آرزؤں کو اس میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

انقلاب فرانس:۔ 1848 فروری میں فرانس کا وہ مشہور انقلاب رونما ہوا۔ جس نے یورپ کے بادشاہوں کے سنگاسن ہلا دئے اور جمہوری عہد کی بنیاد رکھ دی۔

مارکس کے برسلز میں قیام کی وجہ سے کمیونسٹ لیگ کا صدر دفتر لندن سے برسلز منتقل کر دیا گیا تھا۔ انقلاب فرانس کے بعد طے کیا گیا کہ صدر دفتر پیرس لے جایا جائے۔ اور مارکس بھی پیرس میں سکونت اختیار کر کے لیگ کی رہنمائی جاری رکھے۔ ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ انقلاب کی صدائیں برسلز (بلجیم) میں بھی گونجنے لگیں۔ اور برسلز کی پولیس نے اچانک مارکس کو گرفتار کر کے 24 گھنٹے میں ملک چھوڑ جانے کا حکم دے دیا۔

مارکس کے نام فرانس کی انقلابی حکومت کا دعوت نامہ

اس دوران، فرانس کی انقلابی حکومت نے مارکس کو فرانس آ کر قیام کرنے کی دعوت بھیج دی دعوت نامے میں تحریر تھا۔

''جمہوریہ فرانس، ہر آزادی پسند اور مجاہد حریت کے لیے پناہ گاہ ہے۔ آزاد فرانس کے دروازے آپ (مارکس) کے لیے بھی کھول دیے گئے ہیں۔ آپ اور وہ سب جو آزادی اور جمہوریت کے مقدس اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ نیا فرانس سب کا خیر مقدم کرے گا۔''

چنانچہ، مارکس اس دعوت نامہ پر پیرس آ گیا۔ یہاں پہنچ کر مارکس نے کمیونسٹ لیگ کی تنظیم نو کا آغاز کیا۔ اور جرمن مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کو جرمن واپس چلے جانے پر آمادہ کر لیا تا کہ وہاں بھی انقلاب کے لئے وہ لوگ کام کریں۔

پیرس سے رائین لینڈ:۔ کچھ عرصہ بعد مارکس اور اینگلز بھی جرمنی کے علاقہ، رائین لینڈ پہنچ گئے۔ اور جون 1848 کو وہاں سے ''جدید رائین گزٹ'' نکالنا شروع کیا۔ مارکس نے اس اخبار میں

کمیونسٹ انقلاب کی ضرورت اور امکانات پر خوب کھل کر اور پر جوش انداز میں مضامین لکھے۔مارکس ڈیڑھ سال تک اس اخبار کے ذریعہ سرخ انقلاب کا صور یورپ میں پھونکتا رہا۔

اخراج:۔آخر کار وہ وقت آ گیا جب حکومت وقت نے مارکس کو ملک بدر ہو جانے کا نوٹس دے دیا۔19 مئی 1849 کو مارکس نے اخبار کا آخری نمبر نکالا جسے سارا کا سارا لال روشنائی سے چھاپا گیا تھا۔اس کے الوداعی نوٹ کے آخر مارکس نے لکھا تھا۔

''حکومت جھوٹے افسانے تراش کر ہمیں ستانے کے بہانے تلاش کرنے کی زحمت کیوں اٹھا رہی ہے ہم انقلابی کارکن میں ہمیں تمہارے رحم و کرم کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں! ہم جب کامیاب ہوں گے تو سخت گیری کے لئے تمہاری طرح بہانے نہیں تراشیں گے''۔

خستہ حالی:۔اس اخبار کے چلانے میں مارکس کو اپنا سارا اثاثہ لگانا پڑ گیا تھا۔باپ کی وراثت سے حاصل شدہ روپیہ،گھر کا ساز وسامان،اور بیوی کا زیور تک سب ہی کچھ اس اخبار کو کامیاب بنانے کے لیے مارکس نے لگایا تھا اور اب اسے نہایت تہی دستی کے ساتھ جلاوطن ہونا پڑ رہا تھا۔

پیرس میں آمد اور آخراج

مارکس رائین لینڈ (جرمنی) سے ملک بدر ہو کر پیرس آ گیا لیکن اب فرانس کا انقلاب،انقلاب دشمن طاقتوں کی زد میں آ چکا تھا۔یہ طاقتیں مارکس جیسی شخصیت کو فرانس کی سرزمین پر برداشت نہیں کر سکتی تھیں،چنانچہ اسے پیرس میں قیام کرنے کی اجازت نہیں ملی۔

لندن میں آمد:۔بالآخر 23اگست 1949 کو مارکس لندن آ گیا اور پھر زندگی کی آخری سانس تک یہیں مقیم رہا۔

مصائب:۔مارکس،لندن نہایت تہی دستی اور بے سروسامانی کی حالت میں پہنچا تھا۔لندن پہنچتے ہی اس کے گھر میں ایک بچے کی پیدائش ہوگئی۔صورت حال آلام سے کس قدر پُر تھی اس کا اندازہ مارکس کی بیوی کے ان جملوں سے ہوسکتا ہے جو اس کی ڈائری سے ماخوذ ہیں۔

بچہ:۔''ہائے! یہ معصوم فرشتہ جب سے پیدا ہوا ہے،مصائب کا شکار ہے ایک وقت بھی آرام سے

نہیں سوسکا، پیٹ بھر کر دودھ بھی اسے میسر نہیں ہے۔ برابر بیمار چلا آرہا ہے۔ اور سخت ناتواں ہوتا جا رہا ہے''، بچہ بمشکل سال زندہ رہ سکا اور آخر کار دم توڑ گیا۔

رہائش:۔ لندن آ کر، مارکس جس مکان میں ٹھہرا تھا، کچھ عرصہ بعد، مکان کے مالک نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ بڑی تگ ودو کے بعد ''28 ڈین'' میں جگہ ملی۔

مفلسی اور فاقہ زدگی:۔ افلاس نے مارکس اور اس کے گھر کی جو حالت بنا ڈالی تھی، مارکس کی بیوی نے اس کا تھوڑا سا ذکر اپنی ایک سہیلی کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے۔

''میرا دل جس بات پر سب سے زیادہ کڑھ رہا ہے وہ یہ ہے کہ معمولی معمولی باتیں مارکس کے کام میں حرج پیدا کر رہی ہیں۔ اگر ذرا سا سہارا بھی مل جائے تو ہم گزارہ کر لیں گے۔ افسوس جو انسان ہمیشہ دوسروں کی خدمت کے لئے کمربستہ رہا ہو، وہ اتنا مجبور ولاچار ہو جائے۔''

مارکس نے بھی اپنے ایک دوست کو اگست 1851 کے اپنے ایک خط میں اس صورت حال سے یوں مطلع کیا۔

''موجودہ حالات اس قدر خراب ہیں کہ اگر کچھ دن اور یہ جاری رہے تو میری بیوی زندہ نہیں بچے گی۔ مسلسل مصائب اور ہر وقت فاقہ کشی کے اندیشے نے اسے اندر سے بالکل گھلا ڈالا ہے۔ اس پر یہ ستم مستزاد ہے کہ میری مخالف مجھ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے رہتے ہیں۔ میری بیوی یہ سب کچھ سن سن کر پریشان ہو جاتی ہے۔ میرے نادان دوست، میرے مخالفین کی یہ باتیں اسے سنا دیتے ہیں جنہیں سن کر وہ اور زیادہ غم زدہ ہو جاتی ہے۔''

عزم وہمت:۔ ان مصائب کے باوجود، مارکس کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ وہ اپنے نظریات وافکار پر قائم رہا۔ اس نے آرام وآسائش کی خاطر، ہر قسم کے سمجھوتوں اور پیش کشوں کو مسترد کر دیا۔ اس نے انقلاب کے مقصد کے لئے اپنا تحریری جہاد جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی مزدور تحریک اور انقلابی سرگرمیوں کی رہنمائی کے لیے بھی اس نے کبھی تساہل وغفلت سے کام نہیں لیا اور اپنی خستہ حالی کو آڑے آنے نہیں دیا۔

داس کیپیٹل، کی ترتیب وتالیف کا کام بھی اس نے جاری رکھا۔

تین بچوں کی موت:۔ ان ایام میں، مارکس اور جینی کے سامنے، یکے بعد دیگرے ان کے تین

بچے، محض نا کافی غذا، بھوک اور بیماریوں کے درپے حملوں سے، سسک سسک کر دم توڑ گئے۔ دونوں میاں بیوی، تنگ حالی کے بدترین دن کاٹتے رہے۔ یہ زمانہ ان دونوں کے لیے کیسا نازک تھا۔ اور وہ کیسے کربناک حالات سے گذر رہے تھے۔ اس کا اندازہ، مارکس کی بیوی (جینی) کے ان خطوط سے ہوتا ہے، جو اس خاتون نے اپنی بعض قریبی سہیلیوں اور رشتہ داروں کو لکھے ہیں۔

ایک مثالی رفیقہ حیات:۔ جینی کے ان خطوط میں، ایک ایسی پروقار خاتون کا کردار ملتا ہے، جو اپنے شوہر سے غیر متزلزل محبت کرتی ہے۔ وفا شعار ہے، شوہر کے بین الاقوامی اور تاریخی کام میں، اس کی رفیق دہم دم ہے اور اس کا دل صرف اس غم سے لبریز ہے کہ اس کا شوہر کاش اپنا کام فراغت، وسہولت سے انجام دے سکتا۔ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، آخر کار اینگلز نے ایثار و قربانی کا وہ نمونہ پیش کیا جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اور مارکس کو کسی قدر معاشی فکر سے آزاد ہوکر، اپنا کام جاری رکھنے کا موقعہ میسر آ سکا۔

انٹرنیشنل تنظیم کا قیام:۔ 1863 میں مزدوروں کی ایک بڑی کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ وقفہ وقفہ سے بین الاقوامی سطح کی مزدور کانفرنسیں منعقد کی جایا کریں۔

چنانچہ اس تجویز کے مطابق 25 تا 28 ستمبر 1824 کو لندن کے سینٹ مارٹن ہال میں مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت پروفیسر بیسلی نے کی تھی۔ کانفرنس نے مختلف ملکوں کے پندرہ نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس کے ذمہ ایک بین الاقوامی جماعت کے مقاصد و دستور کی ترتیب کا کام لگا دیا گیا۔

دستور کی تیاری

بین الاقوامی انقلاب کی تیاری کرنے والی اس بین الاقوامی جماعت (انٹرنیشنل) کے مصارف کے لیے، تین پونڈ چندہ جمع ہوا۔ پہلے اٹلی کے مشہور محبّ الوطن رہنما، مائیزنی (MAYZAINI) کو دستور مرتب کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ میزینی نے جو مسودہ پیش کیا، کمیٹی نے اسے منظور نہیں کیا۔ اور اتفاق

رائے سے یہ کام مارکس کے حوالے کردیا گیا۔ مارکس نے یہ دستور العمل تیار کیا اور اپنے افتتاحیہ کے ساتھ کمیٹی کے سامنے پیش کردیا۔ کمیٹی نے مکمل رائے سے اسے منظور کرلیا۔ مارکس نے اپنے اس افتتاحیہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ

''محنت کش طبقہ کے لیے اب ضروری ہوگیا ہے کہ وہ سیاسی طاقت پر قبضہ کرے، اور اس مقصد کے لئے، محنت کش طبقہ کے پاس، سب سے بڑا ہتھیار اس کی افرادی تعداد ہے، بشرطیکہ اسے باشعور اور منظّم کرلیا جائے۔ چنانچہ انٹرنیشنل کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف ملکوں کے محنت کاروں کو باشعور بنانے اور منظّم کرنے کا پروگرام پیش کرے اور اس کے ساتھ ہی مزدور تنظیموں کو بھی چاہیئے کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں داخل ہوں، اور اپنے ملکوں کی حکومتوں کے رویہ چالوں کو سمجھتے رہیں۔''

انٹرنیشنل، بیکونن، پرودھون، اور بلانکے، جیسے سوشلسٹ لیڈر بھی شامل تھے، یہ سب مارکس کے مخالف تھے لیکن چونکہ ان کے پاس صرف تخریبی پروگرام کی تجاویز ہوتی تھیں، جب کہ مارکس ہمیشہ تعمیری پیش کرتا تھا۔ اس لئے تنظیم پر مارکس کا ہی اثر جاری رہا۔

پہلا اجلاس

انٹرنیشنل کا پہلا جلسہ 1825 میں برسیلز (بلجیم) میں ہونا طے پایا تھا۔ لیکن حکومت بلجیم نے اجلاس ممنوع قرار دے دیا۔ چنانچہ اجلاس ملتوی کردیا گیا اور بجائے اس کے لندن میں جنرل کونسل کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔

کارل مارکس نے، اس اجلاس میں، نظریہ اقدار پر اپنی ایک کتاب پیش کی۔ ستمبر 1866 میں فرسٹ انٹرنیشنل (پورا نام ہے ''ورکنگ مین انٹرنیشنل ایسوسی ایشن'') کا پہلا جلسہ، جینوا میں منعقد ہوا۔ اور ساتھ نمائندوں نے مختلف ملکوں سے آکر شرکت کی۔ اس اجلاس میں پہلے تو مارکس کا تیار کردہ دستور متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اور بہت سی قراردادیں، جن میں مملکتوں کی طاقت، جاگیرداروں، سرمایہ داروں وغیرہ کے ہاتھوں سے نکل کر، مزدوروں کے ہاتھوں میں آنے، مزدوروں کے لیے تعلیم و تربیت کا انتظام کرنے اور محنت کا بین الاقوامی معیار 8 گھنٹے مقرر کرنے کے مطالبات شامل تھے۔

فرسٹ انٹرنیشنل کا یہ اجلاس، ایک تاریخ ساز اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں برصغیر ہندوستان کے ایک نمائندے نے بھی بطور مبصر کے شرکت کی تھی۔

دوسرا اجلاس

انٹرنیشنل کا دوسرا اجلاس لاؤذین (LAWZANE) کے مقام پر 1827 میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں واضح طور پر کہا گیا کہ تمام ذرائع ریاست کی تحویل وملکیت میں منتقل کر دیے جائیں تا کہ سرمایہ داروں کی اجارہ داری ختم ہوسکے۔

تیسرا اجلاس

انٹرنیشنل کا تیسرا اجلاس برسیلز میں، ستمبر 1828 میں منعقد ہوا۔

قراردادیں

اس اجلاس میں سوشلزم کا نصب العین واضح طور پر پیش کر دیا گیا تھا جو قراردادیں اس اجلاس میں منظور ہوئیں، ان میں سے ایک میں فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ کے خطرہ کے پیش نظر، تمام ملکوں کے مزدوروں سے اپیل کی گئی کہ وہ، جنگ کے خلاف آواز اٹھائیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے ایک عام ہڑتال کرائیں۔

اس قرارداد سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم کے پروگرام میں ''امن'' کے قیام کو اول حیثیت حاصل ہے ایک قرارداد میں کہا گیا کہ!

''ملک کی تمام زمین ذرائع، دولت نقل وحمل وغیرہ سماج کی مشترکہ ملکیت ہونا چاہئیں اور نمائندہ جمہوری حکومت کے ذریعے ان کا انتظام چلایا جانا چاہیئے، جمہوری حکومت، ان پورے وسائل کو، محنت کار انجمنوں کے سپرد کرے تا کہ وہ انجمنیں عدل ومساوات کو پیش نظر رکھ کر، سماج کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ان وسائل کو کام میں لائیں''۔

ایک اور اقرارداد میں

''محنت کار کی پیداوار، محنت کار کے لیے'' کا اصول منظور کیا گیا، اس میں کہا گیا کہ

''محنت کار کو، اس کی محنت کا پورا معاوضہ ملنا چاہیے اور اسے اپنے تمام حقوق کی تکمیل کے لئے، پورے اختیارات حاصل ہونا چاہئیں۔ایک قرارداد میں مزدوروں کی پیشہ وارانہ اور فنی وصنعتی تعلیم وتربیت کی خاطر، محنت کے گھنٹوں میں مزید کمی کا مطالبہ کیا۔اس اجلاس میں 98 نمائندے شریک ہوئے تھے، جو مختلف ملکوں سے آئے تھے۔

آئندہ اجلاس

انٹرنیشنل کا آئندہ اجلاس، بیسل (BASEL) کے مقام پر ستمبر 1869 میں منعقد کیا گیا۔ انٹرنیشنل نے 1870 کے اجلاس کے لئے، پیرس (فرانس) کا انتخاب کیا تھا۔لیکن فرانس اور جرمنی کی جنگ کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔

کمیون نظام کا قیام اور زوال

1870 تا 3 ستمبر کو سیڈان (SADON) میں فرانس کو جرمنی کے ہاتھوں شکست ہوگئی۔فرانس کی اس شکست کے بعد فرانس کے مزدوروں نے، 18 مارچ 1871 کو پیرس میں ''کمیون نظام'' قائم کر دیا۔اور پیرس کی حکومت، پیرس کی رائے عامہ سے منتخب ایک پنچایت نے سنبھال لی۔مگر یہ نظام کل دس ہفتہ زندہ رہا۔اور فرانس کے سرمایہ داروں نے پیرس کی سرمایہ دار حکومتوں کے ساتھ مل کر، ایک زبردست فوجی طاقت کے ساتھ پیرس پر حملہ کیا۔ اور نہایت بے رحمی کے ساتھ شہر میں قتل عام کرایا۔ 20 سے 30 مئی کے دوران دس دن کے اندر اندر لگ بھگ ساڑھے چھ ہزار، کمیون نظام کے حامی افراد کو قتل کیا گیا۔ چالیس ہزار کے قریب جیل خانوں میں بھر دیئے گئے۔اور لوٹ مار کی تو کوئی انتہا نہ رہی۔اس موقع پر مارکس نے، انٹرنیشنل کی طرف سے ایک اعلان شائع کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ

''پیرس کے مزدوروں کا پنچائتی نظام تاریخ میں ہمیشہ یادرکھا جائے گا جس نے ایک نئے سماج کی تشکیل کی نوید سنائی تھی، اور اس نظام کو تباہ کردینے والوں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ان کو بالآخر ذلت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔اور کوئی بچانے والا انہیں نصیب نہیں ہوگا۔''

انٹرنیشنل میں اختلاف

پیرس کمیون، کی شکست نے، یورپ انٹرنیشنل کی سرگرمیوں پر سخت ترین دباؤ ڈالا۔ اس صورت حال سے، انٹرنیشنل میں شامل مختلف سوشلسٹ گروپوں کے درمیان اختلافات ابھر پڑے۔

انٹرنیشنل میں، بیکونن اور پرودھون کے گروپ شروع سے ہی مارکس کے گروپ کے خلاف تھے ان کے درمیان شدید نظریاتی اختلاف موجود تھا، مارکس کا گروپ ایک مکمل سیاسی پروگرام کے ساتھ محنت کاروں کے مقاصد کے لیے کام کر رہا تھا۔ جب کہ پرودھون اور بیکونن کے گروپ ایک ایسے سماجی اور اشتراکی نظام کے داعی تھے جو اقتصادی دفاق پر قائم ہو۔ مگر ان دونوں گروپوں (یعنی پرودھون اور بیکونن کے گروپ) کے سماجی تصورات بجائے خود ایک دوسرے سے بہت مختلف بلکہ متضاد تھے۔ پرودھون اور اس کے حامی، مشترکہ ملکیت کے مخالف اور محدود انفرادی ملکیت کے حق میں تھے۔ لیکن بیکونن کے ماننے والے، کسی قسم کی بھی انفرادی یا ذاتی ملکیت کے سخت مخالف اور انارکزم (ANARCHISM) کے حامی تھے۔

اس صورت حال کو محسوس کر کے، اور یورپ کے ناموافق حالات کو پیش نظر رکھ کر، مارکس نے تجویز کیا کہ، انٹرنیشنل کا صدر مقام، یورپ کے کسی ملک کے بجائے امریکہ میں کسی مقام پر منتقل کر دیا جائے۔

ستمبر 1876 میں ہیگ (HAGUE) میں ایک کنونشن (CONVENTION) بلایا گیا۔ او مارکس کی تجویز اکثریت نے منظور کر لی۔ چنانچہ، انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا مرکزی مقام لندن سے نیویارک منتقل کر دیا گیا۔

ہیگ کنونشن میں ایک فیصلہ یہ بھی ہوا کہ بیکونن اور اس کے حامی گروپ کو جو نراجیت، کے حامی تھے۔ انٹرنیشنل تنظیم سے خارج کر دیا جائے۔

ایمسٹرڈیم کے جلسہ میں مارکس کی تقریر

اس اجلاس میں کئے گئے فیصلے کے مطابق ایمسٹرڈیم (AMASTERDAM) میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں مارکس نے اختتامی تقریر کی۔ مارکس نے کہا اب مزدوروں کو اپنی پرانی حکمت

عملی بدل دینا ہوگی۔ پرانے ادارے ختم کرنا ہوں گے، ہر ملک کے مزدوروں کو یہاں کے حالات کے مطابق اپنے لئے راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر جگہ انقلاب کا مقصد پرامن طریقوں سے حاصل ہو جائے۔بعض جگہوں پر تشدد اور طاقت کا جواب، طاقت سے دینا پڑے گا۔ بہر حال مزدوروں کو لازمی طور پر، ایک دن سیاسی طاقت کو اپنے ہاتھوں میں لینا پڑے گا۔اس کے بغیر وہ محنت کے نظام پر مبنی، تنظیم و تبدیلی کو وجود میں نہیں لا سکتے۔''

فرسٹ انٹرنیشنل کا خاتمہ

انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا لندن سے نیو یارک منتقل کردنیا، مفید ثابت نہیں ہوا اور فرسٹ انٹرنیشنل تنظیم 1876 تک بالکل ختم ہوگئی۔

داس کیپیٹل کی تالیف

فرسٹ انٹرنیشنل کی مصروفیات سے فارغ ہوکر، مارکس نے اپنی مشہور اور عہد آفریں کتاب داس کیپیٹل کی تکمیل توجہ مبذول کی۔

اس کتاب کا پہلا حصہ 1897 میں شائع ہو گیا۔ بقیہ درجے مارکس نے مکمل تو کر لئے، لیکن اپنی زندگی میں انہیں شائع نہ کر سکا۔ان کی اشاعت بعد میں اینگلز نے کی۔اور ''قدر زائد'' کے نظریہ کے نام سے، کاتسکی ، جو دو حصّے شائع کئے، وہ بھی داس کیپیٹل کے ہی اجزا سمجھنے چاہئیں۔

بہر حال داس کیپیٹل کا پہلا حصہ، جسے مارکس نے خود شائع کیا تھا اس میں قریب قریب اس کے تمام نظریات شامل ہیں۔اس ضنیم کتاب میں، مارکس نے سرمایہ دارانہ سماج کے ترقیاتی قانون (LAW OF MOTION)اور سرمایہ دارانہ پیداوار کا مکمل تنقیدی تجزیہ کیا ہے کتاب مین جگہ جگہ انگلستان کی مثالیں درج کی گئیں ہیں۔ مارکس نے یہ کتاب کس طرح لکھی، اس کا کچھ اندازہ اس کے ایک خط سے ہو سکتا ہے جو اس نے اپنے ایک مہربان انجینئر دوست کو لکھا تھا۔

''شاید تم مجھے اچھا انسان نہ سمجھتے ہو، اس لئے کہ میں نے تمہارے خطور کا بہت عرصہ سے جواب نہیں دیا۔ حالانکہ تمہارے خطوط مصائب کے ہجوم میں میرے لئے مسرت کا باعث ہوتے تھے۔ تمہارے خطوط میں میری ذات سے اتنا خلوص ٹپکتا ہے کہ میرے جیسا انسان جس کی ساری عمر مخالفوں کے طعن وتشیغ سنتے اوران کے دار سہتے گذری ہو، ان خطوط سے سکون خاصل کرتا رہا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے تمہیں جواب نہ دیا۔ اس لئے کہ میں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ، اس کتاب کی تصنیف کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کتاب کے لیے میں نے اپنی مسرت وصحت تباہ نہیں کی بلکہ اپنی بیوی اور بچوں کی صحت ومسرت تکاس کی بھینٹ چڑھا ڈالی ہے۔ وہ خود پسند ''عمل'' لوگ جو میری اس مشغولیت کو بے کار ٹھہراتے ہیں، میں ان پر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بیل کی کھال والا انسان ہی غریب انسانوں کے مصائب سے بے پرواہ ہوسکتا ہے اور صرف اپنی کھال کی فکر میں زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن میرے جیسا حساس انسان انسانیت کی مسلسل چیخیں سن کر، خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔

اگر میں اس کتاب (داس کیپیٹل) کی تصنیف کے بغیر مرجاتا تو میرا شمار بھی بے عمل انسانوں میں ہی ہوتا''۔

اینگلز کو، مارکس نے لکھا کہ

''داس کیپیٹل کی پہلی جلد مکمل ہوگئی ہے اور یہ سب کچھ صرف تمہاری توجہ اور عنایت سے ممکن ہوا ہے۔ تم نے اپنی خاموش زبان سے مجھے اس قابل بنائے رکھا کہ میں اس کتاب کو مکمل کر سکا۔ میں اپنی ممنونیت کے احساسات تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اے میرے پیارے دوست'' 1875 میں، جرمن سوشل ڈیموکریسی کے قائد، لاسال (LASSALLE) کے نظریات پر مارکس نے ایک بڑی جاندار تنقید کی۔ جس میں اس نے ریاست، سوشلزم اور سرمایہ داری کے متعلق اپنے نظریہ کی بڑی خوبی کے ساتھ وضاحت کی ہے۔

پرولتاری ڈکٹیڑشپ'' کی اصطلاح کا سب سے پہلے استعمال مارکس نے اپنی اس تحریر میں ہی کیا ہے، وہ لکھتا ہے۔

''سرمایہ دارانہ سماج سے، اشتراکی سماج میں تبدیلی کے عمل دوران ایک ایسا وقفہ ضروری ہے جب انقلاب ہے جب انقلاب کا عمل کارفرما، ہورہا ہو۔ یہ ایک عبوری دور ہے اور اس دور میں ریاست کی

ہیئت، پرولتاریہ ڈکٹیٹر شپ‘‘ ہی کی صورت اختیار کرے گی۔‘‘

مارکسی فکر کی تشکیل

غور کیجئے تو مارکس نے، اپنی تحریروں اور تعلیمات میں، انیسویں صدی کے تین اہم ترین علمی اور فکری رجحانات کا امتزاج کیا ہے اور انہیں ترقی دے کر تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ یہ رجحانات یورپ کے انتہائی ترقی یافتہ تین ملکوں میں فروغ پا رہے تھے۔

۱۔ انگلستان کا کلاسکی علم المعیشت (CLASSICAL POLITICAL ECONOMY)

۲۔ جرمنی کا کلاسیکی فلسفہ۔ اور (۳) فرانس کے سوشلزم اور انقلابی نظریات۔

آخری ایام

1875 سے 1883 تک، مارکس مختلف بیماریوں کا شکار رہا۔ لیکن بیماری اور تکالیف جسمانی کے ان ایام میں بھی، مارکس نے، امریکہ اور روس کے زرعی حالات کا گہرا مطالعہ کیا۔ کیمسٹری۔ طبعیات، حیاتیات اور ریاضی کے علوم پر بطور خاص ایک بار پھر گہری نظر ڈالی۔ اس طرح اس کی صحت اور بھی گر گئی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ تبدیلی آب وہوا کے لیے۔ کارسباز کے صحت افزا مقام پر چلا جائے۔ وہ 1874 میں اس مقصد کے لیے وہاں گیا تھا۔ اور کافی فائدہ بھی ہوا تھا۔ اس مرتبہ بھی اس نے ڈاکٹروں کے مشورہ پر عمل کرنا چاہا لیکن جرمن اور آسٹروی حکومتوں نے اعلان کر دیا کہ اگر مارکس یہاں آیا تو ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ چونکہ کارسباز، کا مقام ان دونوں حکومتوں کے زیر انتظام تھا اس لئے مجبوراً مارکس وہاں نہیں جاسکا۔

بیوی کی وفات

اس دوران مارکس کی بیوی شدید علیل ہوگئی اور 3 دسمبر 1881 کو وفات ہوگئی۔ اس صدمہ نے

مارکس کو بالکل نڈھال کر دیا۔ اینگلز کو جیسے ہی اس سانحہ کی خبر ملی دوڑتا ہوا آیا۔ اور اس نے بے ساختہ کہا کہ ''جینی تنہا ہی مری مور (مارکس) بھی اس کے ساتھ مر گیا۔

مارکس کا انتقال

اور واقعی کچھ عرصہ بعد یعنی 14 مارچ 1883 کو مارکس بھی اس دنیا سے چل بسا۔ اینگلز نے اپنے ایک امریکی دوست سورژے (SORZE) کو لکھا۔

''14 مارچ سہ پہر پونے تین بجے موجودہ دنیا کا سب سے بڑا دماغ اٹھ گیا۔''

نوٹ:۔ مارکس کے افکار و نظریات کی بنیاد، ہیگل کے نظریہ اضداد و جدلیت پر ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہیگل کی، منطقیت، پر ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی شہرہ آفاق کتاب، داس کیپیٹل کے مندرجات کو سمجھنے سے پیشتر، ہیگل کی پیش کردہ منطق کو سمجھا جائے۔

ہیگل کی فکر

مارکس نے ہیگل کے بارے میں لکھا ہے۔

''وہ عینیت پسند (IDEALIST) مفکر تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خیالات و تصورات خارجی اشیاء کا عکس نہیں ہوتا بلکہ خارجی اشیا اس ''تصور مطلق'' کا عکس میں جو ہستی کے ظہور سے پہلے موجود تھا۔''

جیسا کہ میں نے، گزشتہ اوراق میں کہیں ذکر کیا ہے کہ مارکس نے، جرمن کی کلاسیکل فلاسفی، انگلستان سے کلاسیکل علم المعیشت اور فرانس کی انقلابیت اور نظریات و رجحانات کے علمی اور فکری امتزاج سے اپنا فکر تشکیل دیا تھا۔ اس نے ہیگل کی منطقیت اور فویر باخ (جو ہیگل کا ایک پیرو کار تھا) کی مادیت کو اساس بنا کر اس پر اپنے فکر کی عمارت تعمیر کی تھی۔

علم منطق

علم منطق کا آغاز قدیم ہندی اور یونانی حکماء سے ہوا، یونان میں ''زینو'' نامی ایک حکیم نے علم منطق پر کتابیں لکھی۔ ارسطو، سقراط اور اقلیدس، افلاطون وغیرہ نے بھی اس علم کی ترقی میں بہت حصہ لیا۔ مگر بعد کے دور میں ارسطو کے ترتیب دیئے ہوئے منطق کے اصول ہی مقبول ہوئے۔ اور ان اصولوں کو ہی، سولہویں صدی تک علم منطق کے مسلمات ہی مانا جاتا رہا۔ لیکن سولہویں صدی کے بعد علم منطق کی کچھ اور کچھ اور شاخیں بھی دریافت ہوئیں۔ مثلاً

۱۔ احتمالی منطق (LOGIC OF PROBABILTY)

۲۔ اشاراتی منطق (SYMBOLIC LOGIC)

۳۔ جدلیاتی منطق (LOGIC OF CONTRADICTIONS)

عینی منطق

ارسطو کے اصول پر مبنی قدیم منطق کو عینی منطق (IDEALISTIC LOGIC) کہا جاتا ہے یہ قدیم عینی منطق، تین اجزا پر مشتمل ہے۔

''مقدمہ کبریٰ'' ''مقدمہ صغریٰ'' ''اور حد اوسط''

عینی منطق کا بنیادی اصول یہ ہے کہ، دو متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں یعنی منطق کی رو سے، متضاد اشیا کی درمیانی تقسیم، ایک اٹل بات ہے جو منسوخ نہیں کی جا سکتی۔ کوئی چیز یا تو ہے، یا نہیں ہے، ان دونوں باتوں کے علاوہ، کسی تیسری صورت کی، عینی منطق میں جگہ نہیں ہے۔

احتمالی منطق

احتمالی منطق میں اضافی اور مقداری تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔

اشاراتی منطق

اشاراتی منطق، علم ریاضی کی خالق ہے اور اسی میں معکوس اور متعدی تعلقات کی بات کی جاتی ہے۔منطق کی اور بھی بہت سی شاخیں ہیں جو خاص خاص علوم تک محدود ہیں لیکن عینی منطق ہمہ گیر منطق ہے۔

اضدادی منطق

اس کے مقابلہ میں ہیگل نے جدلیاتی یا اضدادی منطق کا نظریہ پیش کیا۔اس منطق کی رو سے، دو متضاد باتیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں۔ان میں تصادم برپا ہوتا ہے اور اس تصادم کے نتیجہ میں اس تیسری بات وجود میں آتی ہے۔دراصل ارسطو مکتب فکر کی عینی منطق میں، امکانات کے تسلسل کی بات ہوتی ہے، حرکت اور تغیر و تبدل کی بات نہیں ہوتی۔اب اگر دنیا ساکن اور غیر متحرک ہے تو ارسطو کی عینی منطق ہی تصورات کے لیے کام آئے گی۔لیکن اگر دنیا میں تغیر و تبدل برپا ہے اور ارتقا کا عمل جاری ہے تو ہیگل کی اضدادی منطق سے ہی حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ارسطو کی عینی منطق، صغریٰ اور کبریٰ سے نکالنے کے لیے ''ضد'' کے عنصر کو خارج کر دیتی ہے۔جب کہ ہیگل کی منطق ''کو شامل کر کے، حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔

ہیگل کی منطق کا مارکسی نظریہ

لیکن ہیگل کی، اضدادی منطق کا یہ عمل بھی تصوراتی ہوتا ہے، یعنی وہ کہتا ہے کہ ''حقیقت'' تصور سے تخلیق پاتی ہے نہ کہ ''تصور'' حقیقت سے پیدا ہوتا ہے، تو اس مقام پر، مارکس اپنے نظریہ کو ہیگل کے ''تصور'' سے علیحدہ کر لیتا ہے۔مارکس، قدیم عینیت اور قدیم مادیت دونوں کو ہی رد کرتا ہے وہ فویرباخ کی مادیت دونوں کے بارے لکھتا ہے کہ، ان سے محض دنیا کی تفسیر تو بیان کی جا سکتی ہے۔لیکن دنیا میں تبدیلیاں لانے کا عمل ان سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔اس طرح وہ ہیگل کے اضدادی نظریہ کو تصوراتی اور

عینی رکھنے کی بجائے، تاریخی شکل مین تبدیل کر دیتا ہے۔

اینگلز کی تشریح

اینگلز نے اس کی توضیح اس طرح کی ہے۔

''مادہ کا وجود حرکت پر مبنی ہے۔حرکت کے بغیر مادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔خیال وشعور انسانی دماغ کی پیداوار ہوتے ہیں۔انسان فطرت کی پیداوار ہے، جو اپنے ماحول کے اندر، ماحول کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے اس طرح آخری تجزیہ میں، انسانی دماغ کے پیداوار بھی فطرت کی پیداوار ہوتی ہے''۔

اضدادی منطق سے ہمیں یہ حاصل ہوا کہ، کسی لفظ کے صحیح معنی سمجھنے کے لیے، آسان طریقہ یہ ہے کہ اس لفظ کو بحث کا موضوع بنالیا جائے۔اور اسی طرح موافق، مخالف آراء کے تصادم سے حقیقت واضح ہوکر سامنے آجائے گی۔حقیقت کو جاننے کا اضدادی اسلوب یہ ہی ہے۔

قدیم عینی منطق، اسی سلسلہ میں کام نہیں دیتی۔بلکہ مغالطہ میں ڈالنے والی ثابت ہوتی ہے۔وہ ضد اور مخالفت کے عنصر کو ترک کر دیتی ہے۔اور اسی طرح غیر متحرک تصورات تک محدود ہو جاتی ہے۔جب کہ حرکت وتغیر کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی ضد اور مخالفت سے ٹکراتے ہوئے آگے نکلا جائے اس لئے کہ ترقی کا عمل اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔یہ ہی ہیگل کی وہ جدلیاتی منطق ہے جس کو عینیت پسندی کے بجائے، مارکس نے تاریخی تشریح کے ساتھ مادی حقیقت میں تبدیل کیا۔اور پھر اسے ایک ''تاریخ اقتصادی'' نظریہ بنا دیا۔

داس کیپیٹل مضامین کی تلخیص

اجناس

(COMMODITIES)

وہ سوسائیاں (SOCIETIES) جن میں پیداوار کے سرمایہ دارانہ طریقے رائج ہوتے ہیں ان کی دولت (WEALTH) کا اظہار اجناس کے بڑے بڑے ذخیروں کی شکل میں ہوتا ہے اور ہر

واحد جنس، اس دولت کی اکائی ہوتی ہے۔

جنس (COMMODITY) انسانی محنت سے تیار کی ہوئی ایسی چیز کا نام ہے جو صرف ذاتی استعمال کے لیے نہیں بلکہ فروخت کے لیے تیار کی گئی ہو۔ صرف ذاتی استعمال کے لیے تیار کی گئی چیز اقتصادی اصطلاح میں جنس (COMMODITY) نہیں ہے۔

انسان اپنی محنت سے وہی چیز تیار کرتا ہے جو انسان کی کسی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے۔

قدر افادہ

تیار کردہ چیز کا یہ وصف ''قدر افادہ'' (USE VALUE) کہلاتا ہے۔ دنیا میں ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جو اپنے اندر ''قدر افادہ'' (USE VALUE) تو رکھتی ہیں لیکن انسان کی محنت سے وہ پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ جیسے سورج کی روشنی، دریا کا پانی، فضا کی ہوا اور جنگل کے پھل پھول وغیرہ وغیرہ۔

پس انسان جو چیز صرف نجی استعمال کے لیے نہیں بلکہ خرید و فروخت کے لئے تیار کرتا ہے۔ وہ جنس (COMMODITY) ہے اور اس پر ہی اقتصادی عمل اور نظام کے ضابطے اور قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔

محنت

ہر جنس (COMMODITY) اپنے اندر ایک بنیادی ''قدر'' رکھتی ہے اور وہ ''قدر'' ہے انسان کی ''محنت''، کوئی جنس ''انسانی محنت'' کے بغیر تیار نہیں ہو سکتی پس ہر جنس دو اجزء سے مرکب ہے۔ ایک جز مادہ ہے جسے انسان نے نہیں فطرت نے پیدا کیا ہے۔ اور دوسرا جز انسان کی محنت ہے جو اس ''مادہ'' کو جنس بنانے پر خرچ ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ جنس میں جو جو قدریں اور اوصاف پیدا ہوتے ہیں وہ صرف انسانی محنت ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے تمام اجناس کی اصل اور بنیادی قدر انسان کی محنت ہے قدرت کا عمل مادہ کو مختلف شکلوں میں بدلتا رہتا ہے۔ اور انسان کی محنت مادہ کی ان اشکال سے مختلف اجناس تیار کرتی رہتی

ہے۔ چنانچہ اجناس میں استعمال کی گئی انسان کی یہ محنت ''قدر'' (VALUE) کہلاتی ہے۔

محنت کے دو پہلو

اس محنت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ کہ ہر جنس تیار کرتے وقت اس پر انسان کی عام جسمانی محنت خرچ ہوتی ہے۔ اور دوسرا پہلو یہ کہ علیحدہ علیحدہ اجناس پر، علیحدہ علیحدہ پیشوں کی صورت میں فنی اعتبار سے بھی محنت خرچ ہوتی ہے جس سے اجناس کی علیحدہ اور مخصوص شکلیں تیار ہو جاتی ہیں۔ محنت کا یہ دوسرا پہلو بھی محنت کے پہلے پہلو کا ہی ایک حصہ ہے جسے انسان اجناس تیار کرتے وقت استعمال کرتا ہے۔

چنانچہ جنس کی ہر ''قدر'' صرف اس محنت کی ہی مرہون منت ہے۔

عام اور خاص

چنانچہ یہ محنت بیک وقت عام بھی ہے اس لئے کہ اس سے جنس میں ''قدر'' پیدا ہوئی۔ اور خاص بھی ہے اس لیے کہ اس محنت سے ہی اس میں استعمال ''قدر'' پیدا ہوئی۔

مقدار محنت

اجناس جب تیار ہو جاتی ہیں تو جب ضرورت ان کے درمیان تبادلہ کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور یہ فرق سامنے آتا ہے کہ کس جنس پر محنت کی کتنی مقدار خرچ ہوئی ہے۔ اور پھر مختلف اجناس پر خرچ شدہ محنت کی مقدار سے تبادلہ کی نسبت کا تعین ہوتا ہے۔ اب اگر محنت کی کم مقدار سے اجناس زیادہ تیار ہو رہی ہے ہیں۔ تو یہ محنت کی پیداوار میں اضافہ کا عمل ہوتا ہے۔ اور اگر محنت کی زیادہ مقدار سے اجناس کم تیار ہو رہی ہیں۔ تو یہ محنت کی پیداوار میں کمی کا عمل کہلاتا ہے۔

قدر تبادلہ

چنانچہ جب محنت گھٹے گی تو جنس کی قدر تبادلہ (EXCHANGE-VALRE) بھی گھٹ جائے گی۔ اور جب محنت بڑھے گی تو جنس کی قدر تبادلہ بھی بڑھ جائے گی۔ اس طرح پہلی صورت میں چیزیں سستی ہو جائیں گی۔ دوسری صورت میں چیزیں مہنگی ہو جائیں گی۔

ایلمونیم دھات پہلے چاندی سے بھی زیادہ مہنگی تھی اس لئے کہ اس کی تیاری میں بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی۔ لیکن بعد ارزاں ہوتی چلی گئی۔ اس لئے کی ٹیکنیکل سائنس کی ترقی نے اس دھات کی تیاری میں نسانی محنت کے عنصر کو گھٹا دیا۔ اور تھوڑی سی محنت سے ایلومونیم بہت زیادہ دستیاب ہونے لگی۔

باہمی تبادلہ

انسانی محنت اور تیار شدہ جنس کی ''قدر'' کا یہ پہلو سی وقت سامنے آتا ہے جب ایک جنس کے مقابلہ میں دوسری جنس آجائے دران کا باہم تبادلہ ہو۔ ایک تولہ سونا اور ایک ٹن لوہے کے درمیان ''قدر کی نسبت'' اس محنت سے ہی متعین ہوگی جو دونوں دھاتوں کی تیاری پر صرف ہوئی ہے۔

قدر تبادلہ کا اظہار

تو ہر جنس کی قدر تبادلہ (EXCHANGE VALUE) کا اظہار اس جنس کی تیاری میں صرف ہونے والے محنت کے وقت سے ہو سکے گا۔

قیمت

اس ترقی یافتہ دور میں چونکہ جنس سے جنس کے تبادلہ کی جگہ زر جنس کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس لئے اب جنس کی قدر کا تعین زر کی شکل میں کیا جائے گا۔ یعنی یہ کہا جائے گا کہ اس جنس کی قیمت کیا ہے۔

مقدار محنت

بہر حال اس صورت میں بھی جنس کی قدر کا انحصار اس پر صرف کی ہوئی محنت کی مقدار پر ہی ہوگا۔ اور محنت کی یہ مقدار رائج حالات پیداوار کے اوسط درجہ کی ہنرمندی اور تیز کاری کے مطابق ہوگی جو کسی جنس کے تیار کرنے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔اسی طرح جنس کے ساتھ کئی قدریں شامل ہو جاتی ہیں۔

قدر استعمال اور مبادلہ کا تضاد

یہاں یہ بات واضح رہے کہ

خرید و فروخت کے لیے تیار کردہ جنس کی استعمال قدر سے جنس تیار کرنے والا محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے جنس کی صرف قدر مبادلہ رہ جاتی ہے جب کہ جنس خریدنے والا قدر مبادلہ سے محروم رہ جاتا ہے اور اس کے لیے جنس کی صرف استعمال قدر باقی رہ جاتی ہے۔ یہ ایک لازمی تضاد ہے جو ہر جنس کی قدر استعمال اور قدر مبادلہ کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ایک مثال

کسان غلہ پیدا کرتا ہے۔ اگر اس نے یہ غلّہ اپنے استعمال کے لیے پیدا کیا ہے تو یہ ''جنس'' (COMMODITY) نہیں ہے اور اگر فروخت کے لیے اس نے غلّہ پیدا کیا ہے تو یہ ''جنس'' (COMMODITY) ہے اس غلّہ کے پیدا کرنے میں کسان کی جو محنت خرچ ہوتی ہے اس محنت کی مقدار کے تناسب سے غلّہ کی ''قدر مبادلہ'' (EXCHANGE VALUE) متعین ہوگی۔

مقدار محنت کا معیار

کسان کی مقدار محنت کا معیار محنت کے ان اوقات کے مطابق ہوتا ہے جو عام طور پر کسانوں کی اکثریت غلہ پیدا کرنے کی مجموعی کے دائرے میں صرف کرتی ہے۔مزدور کی مقدار محنت کا معیار بس اسی قاعدہ کے مطابق مقرر ہوتا ہے۔

محنتوں کا اختلاف

یہاں محنتوں کے اختلاف کو بھی جان لینا ضروری ہے۔

ایک موچی کی محنت،فونڈری میں کام کرنے والے محنت سے بالکل مختلف ہے۔درزی کی محنت اور کان میں کام کرنے کی محنت کے درمیان بھی کوئی مطابقت نہیں ہے سادہ محنت اور ہنرمندانہ محنت کے درمیان بھی بڑا اختلاف ہے۔ایک شخص کپڑا بنتا ہے اور ایک سائیکل بناتا ہے۔ان دونوں کی محنتوں میں بھی زبردست اختلاف موجود ہے۔

سادہ محنت اور مرکب محنت

دراصل سادہ محنت ہیں کسی ہنرمندی کی ضرورت نہیں ہے محض عام سمجھ بوجھ سے ایک شخص سادہ محنت کار بن سکتا ہے۔لیکن سائیکل،موٹر،ریڈیو،الیکٹرک وغیرہ کا کام کرنے والا شخص متعلقہ چیز کا ہنر سیکھے گا۔

اس قسم کی محنت کہتے ہیں۔لیکن سادہ محنت اور مرکب محنت دونوں کے اپنی اپنی جگہ مدراج ومراتب ہیں۔

سادہ محنت

ایک سادہ محنت صرف بوجھ اٹھانے وغیرہ کے کاموں پر مشتمل ہوتی ہے۔لیکن ایک سادہ محنت میں کام کرنے کی ایک ترتیب ملحوظ رکھنا ہوتی ہے جو معمولی سوجھ بوجھ اور مشق سے حاصل ہوجاتی ہے۔

جیسے جولاہا یا چٹائی بننے والا شخص جسے صرف اسی کام کی معمولی سوجھ بوجھ معلوم ہو۔

مرکب محنت

مگر بڑھئی کا کام، لوہار کا کام یا اس سے آگے گھڑی سازی، ریڈیو سازی وغیرہ میں بالترتیب مرکب کے مدارج قائم ہوتے جاتے ہیں۔اس طرح ہر کام ہر پیشے اور ہر ہنر کی محنت کا معیار مختلف ہو جاتا ہے۔اور اس معیار کی نسبت سے ہی ان محنت کاروں کی تیار کردہ اجناس کے مابین قدر تبادلہ کا تعین ہوتا ہے۔

قدر اور محنت

لیکن ہر حالت میں اس قدر کا معیار محنت پر ہی مقرر ہونا چاہیئے۔ایک سادہ محنت کار، جتنی محنت 6 گھنٹے میں صرف کرتا ہے۔مرکب محنت کار اتنی محنت ایک گھنٹہ میں یا اس سے کم وبیش وقت میں کر گذرتا ہے۔جس کا اس کے پیشے کی ہنرمندی اور کاریگری پر انحصار ہے۔

پس سادہ محنت کار اور مرکب محنت کار کی یہ ہی محنت ''قدر مبادلہ'' مقرر کرتی ہے یہ ہی تیار شدہ جنس کی ''قدر اصل'' بھی ہے۔

قدر استعمال قدر مبادلہ نہیں ہے

قدا استعمال سے کسی چیز کی قدر مبادلہ متعین نہیں کی جاتی۔مثال کے طور پر دو بچے ہیں۔ان میں سے ایک کے پاس سیب ہے۔اور دوسرے کے پاس کوئی کھلونا اب اگر وہ دونوں اسے آپس میں بدل لیں تو، یہ محض قدر استعمال کے طور پر دونوں چیزوں کا باہم تبادلہ کریں گے۔

ایک لڑکا سیب اس لیے لے گا کہ وہ اسے کھانا چاہے گا۔اور دوسرا کھلونا اس لیے لے گا کہ وہ اس سے کھیلنا چاہے گا۔

اگر اس قدر استعمال کا مقصد ان دونوں کے درمیان نہ ہو، اور دونوں چیزوں کا تبادلہ قدر اصل یا قدر مبادلہ کی حیثیت سے کیا جائے تو یقیناً ایک عدد کھلونا (مثلاً گڑیا لٹو پتنگ وغیرہ) ایک عدد سیب کے مساوی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ جو معیاری محنت جداگانہ پر ان دونوں چیزوں پر خرچ ہوئی ہے وہ مختلف بھی

ہے اور ایک دوسرے سے متضاد بھی۔

چنانچہ اس محنت کی نسبت سے یا ایک سیب کے بدلے میں کئی کھلونے دنیا ہوں گے یا ایک کھلونے کے بدلے میں کئی سیب دنیا ہوں گے۔

محنت میں کیفیت اور کمیت کا فرق

اس مثال سے محنت کی کیفیت و کمیت کا فرق بھی معلوم ہو گیا۔

سماج میں رائج قدر مبادلہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سماج میں محنت کے کمیت کے پہلو کو غلبہ حاصل ہے جیسا کہ ابھی تک ہمارے سماج میں پایا جاتا ہے۔ اور اگر سماج میں قدر استعمال رائج ہو جائے تو تبادلہ اس طرح ہو گا جیسا کہ دو بچوں کی مثال میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے محنت کے کیفیت والے پہلو کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔

محنت کا کمیتی پہلو

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ موجودہ سماج میں انسانی محنت سے تیار ہونے والی اشیا کا تبادلہ انسانی محنت کے ''کمیت'' والے پہلو کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے اور اس طرح جو معاشی نظام اس سماج میں قائم و رائج چلا آ رہا ہے۔ اس میں ''کمیت'' کے تناسب سے ''اجناس کی قدریں'' متعین ہوتی ہیں۔ ''کیفیت'' کے تناسب سے نہیں۔ موجودہ سماج میں محنت کا ''کیفت'' والا پہلو محض بیگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ حالانکہ انسانی ضریات کا اصل مقصود، اجناس کی، استعمال قدر ہی ہے۔ جو تمام پر محنت کے ''کیفیت'' والے پہلو کی حامل ہے۔

محنت کا کیفیتی پہلو

چنانچہ معاشی نظام سوشلزم پر مبنی اقتصادی تبدیلیاں جب اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائیں گی تو ایک ایسی سماج وجود میں آ جائے گی جس میں اجناس کا تبادلہ، اشیا کی ''استعمال قدر'' کے نقطہ نگاہ سے ہوا کرے گا۔ اور انسانی محنت کا تعین بھی صرف ''کیفیت'' کے نقطہ نظر سے ہو گا۔

ایک سماج کے افراد کے درمیان باہمی رشتہ کا اظہار

چونکہ مختلف اجناس کے ''مابین'' تبادلہ کے عمل کی رائج صورت سے افراد کے باہمی رشتے کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے ان افراد کے درمیان تعلق کی نوعیت بھی متعین ہو جاتی ہے اس لئے تبادلہ کے عمل کی کیفیت بتا دیتی ہے کہ یہ تمام افراد کس سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔یعنی بازار کے لین دین کے طریقہ سے ایک سماج کی صورت بن جاتی ہے۔چنانچہ اگر سماج کے افرا،اجناس کا تبادلہ استعمالی قدر کے مطابق کرتے ہیں تو اس سماج کا نام استعمالی سماج ہوگا ورنہ وہ غیر استعمالی سماج ہے۔

غیر استعمالی حیثیت میں وہ سماج غلام دارانہ سماج ہوسکتی ہے۔جا گیردارانہ سماج ہوسکتی ہے،سرمایہ دارانہ سماج ہوسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہاں سے اس فرق کو بھی سمجھ لینا چاہیئے جو سرمایہ دارانہ سماج اور اشترا کی سماج کے درمیان اجناس اور اس کی قدر قیمت کے بارے میں پایا جاتا ہے۔

قدر کا انحصار

''جنس''(COMMODITY) کی تعریف وتجزیہ سے یہ بات واضح ہوگئی ہے۔کہ جنس کی ''قدر''(VALUE) سماجی طور پر معیاری لازمی محنت پر منحصر ہے یعنی عام خاص محنت سے جنس کی ''قدر'' کا معیار مقرر ہوتا ہے۔اور سماج کے افراد کے درمیان یہ ہی بنیادی رشتہ قائم ہوتا ہے۔

سرمایہ داری کا مغالطہ

لیکن سرمایہ دارانہ سماج میں یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ ''جنس'' کی قدر (VALUE) رسد وطلب سے مقرر ہوتی ہے۔

رسد وطلب کیا ہے؟

حالانکہ رسد وطلب سے جنس کی قدر،مقرر نہیں ہوتی بلکہ ''قیمت'' مقرر ہوتی ہے۔''قیمت'' جنس کی

''قدر'' کی وہ شکل ہے جو ''زر'' کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ ''زر'' کا نظام ایک واسطہ کی صورت میں، اجناس کے تبادلہ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تبادلہ اجناس کی فطری شکل باقی نہیں رہتی۔ ایک تیسرے عنصر کے شامل ہو جانے سے استحصال کا عمل ہر دو طرف اپنے بازو پھیلا دیتا ہے۔ یہ عمل ''بازار'' اور ''مقابلہ'' کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ طلب و رسد کے اقتصادی قوانین کا سلسلہ یہاں سے ہی شروع ہوتا ہے۔

چنانچہ جنس اور اس کے تبادلہ کا جو عمل محنت کے معیار سے بنتا تھا۔ اب وہ عمل بازار اور مقابلہ میں آ کر ''زر'' کے معیار سے ناپا جانے لگتا ہے۔

پس کبھی ''جنس'' کی ''قیمت'' اس کی اصل ''قدر'' سے کم ہو جاتی ہے اور کبھی اصل ''قدر'' سے بڑھ جاتی ہے۔ حالانکہ محور اصل ''قدر'' ہی بنی رہتی ہے۔ یعنی محنت کے ہی استحصال سے جنس کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

سماجی تغیرات

زمانہ قدیم میں ہر آدمی اپنی قوت واستعداد سے اپنے کھانے پینے کی اشیا حاصل کرتا اور زندگی گزارتا تھا۔ ایسے انسانوں کی سماج کی مکمل مساوات کی سماج تھی پھر ایسا ہوا کہ انسان مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا۔ اور ایک گروہ نے دوسرے گروہ استبداد حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔

غلام دارانہ سماج

اس طرح غلام داری کے دور کا آغاز ہوا۔ اب ایک ہی سماج میں انسانوں کے دو طبقے بن گئے۔ ایک آقاؤں کے طبقہ کی محنت سے حاصل شدہ اشیاء پر بلا محنت اپنا حق تصرف قائم کر لیا۔

جاگیردارانہ سماج

جاگیردارانہ آیا تو جاگیردارانہ کاشت کار کے درمیان بھی یہ ہی سماجی تعلق قائم رہا اور کاشت کار کی

محنت کی حاصل جاگیردار کے تصرف میں آتا رہا۔

سرمایہ دارانہ سماج

اب سرمایہ داری کا دور آیا ہے تو سرمایہ دار نے، مزدور کی محنت کا حاصل اپنے تصرف میں لے لیا ہے۔

تاہم غلام دارانہ عہد اور جاگردارانہ عہد میں غلام اور کاشت کار کی محنت کا حاصل آقا اور جاگیردار کو ایک حد کے اندر ہی حاصل ہوتا تھا لیکن سرمایہ دارانہ عہد میں صورت حال بہت شدید ہوگئی ہے۔ اور مزدور کی زائد محنت کا استحصال چندہ چند ہونے لگا ہے۔ ایسا کس طرح ہوا اسے ذیل میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

زائد محنت کا استحصال

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ

''جنس'' مادہ اور محنت کے امتزاج سے بنتی ہے۔ یعنی ایک محنت کار کسی مادی شے پر جو خالصتاً فطرت کی پیداوار ہے محنت کر کے اسے انسانی ضرورت کے لئے کسی دوسری جنس سے تبادلہ کی خاطر تیار کرتا ہے۔

اسی طرح تیار شدہ، جنس میں، محنت کی قدر (VALUE) داخل ہو جاتی ہے۔ اور یہ ہی قدر، اس جنس کی قدر تبادلہ اور قیمت بنتی ہے۔

''زر'' کے نظام نے محنت کی اس ''قدر'' کو طلب و رسد کا پابند بنا دیا ہے۔

جس کے زور پر سرمایہ دار مزدور کی محنت اور زائد محنت کی قدر زائد (SURPLUS VALUE) اور اضافی قدر زائد (RELATIVE SURPLUS VALUE) کو اپنا منافع بنا لیتا ہے۔

سرمایہ محنت سے بنا ہے

یہ ''زر'' جو سرمایہ بنتا ہے، یہ بھی مزدور کی ''محنت'' ہی کی ایک شکل ہے۔ جو بظاہر ایک جداگانہ اور مستقل شے نظر آتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے،

فطری وسائل پیداوار

سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار کے تمام وسائل جو خالصتاً فطرت کے پیدا کردہ ہیں مثلاً جنگلات، کانیں، تیل کے چشمے، چراگاہیں، قابل کاشت زمینیں وغیرہ وغیرہ ان سب سے مزدور طبقہ محروم کر دیا جاتا ہے۔

یہ صورت جاگیردارانہ اور غلام دارانہ سماج میں بھی پائی جاتی ہے مگر ایک حد کے اندر، لیکن سرمایہ دارانہ سماج میں کلیتہً اور تمام کی تمام۔

آلات پیداوار

اس کے ساتھ ہی سرمایہ دارانہ سماج میں آلات پیداوار سے بھی رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ دور محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں، خام مال، ذرائع پیداوار، اور آلات پیداوار تینوں ہی بنیادی چیزوں سے مزدور کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور ان پر سرمایہ دار قبضہ جما لیتا ہے۔ اب سرمایہ دار کے ہاتھوں میں یہ تینوں چیزیں استحصالی ہتھیار بن جاتی ہیں۔ جس کے ذریعہ سرمایہ دار مزدور کی محنت کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرتا رہتا ہے۔

سوال

سوال یہ ہے کہ یہ خام مال، یہ ذرائع پیداوار اور یہ آلات پیداوار تو سرمایہ نہیں ہیں۔ اور مزدور کی محنت جو ان چیزوں پر خرچ ہوتی ہے۔ اور اجناس (COMMODITES) تیار کرتی ہے وہ بھی سرمایہ نہیں ہے۔

تو سرمایہ کیا چیز ہے؟ جس کے بل پر سرمایہ دار مزدور کا استحصال کرتا ہے۔

سرمایہ

غور کیجئے تو یہ (یعنی سرمایہ) سماج کے اس نئے تعلق کا نام ہے جو غلام داری اور جاگیرداری کے عہد کے بعد، ایک اور صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ پہلے آقا، غلام کی محنت کا براہ راست استحصال کرتا تھا اور جاگیردار کسان کی محنت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے قبضہ میں کر لیتا تھا۔

اور اب سرمایہ دارانہ سماج میں، مزدور کی محنت اور زائد محنت کی قدر تبادلہ اور قدر زائد کو بازار میں لا کر بالواسطہ ''زر'' کی قیمت کے ذریعہ سرمایہ دار کا منافع بنالیا جاتا ہے۔

اس بالواسطہ ذریعہ (زر) کو ہی سرمایہ کہا جاتا ہے۔ جو دراصل مزدور کی زائد محنت سے پیدا شدہ اضافی قدر زائد کا ایک حصہ ہے۔ جسے نئے سماجی تعلق نے نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔

سرمایہ صرف سماجی رشتہ کا نام ہے

چنانچہ ''سرمایہ'' دراصل اس سماجی تعلق کا نام ہے جو سماج کے ایسے دو طبقوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جن میں سے ایک پیداوار کے تمام ذرائع اور وسائل پر قابض ہے اور دوسرا ان سے مطلقاً محروم کر دیا گیا ہے۔ سرمایہ کسی ایسی چیز کا نام نہیں ہے جو اپنا مادی وجود رکھتی ہو۔

سرمایہ بے جان محنت

سرمایہ، بے جان محنت کا نام ہے جو جونک کی طرح محنت کا خون چوس کر زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اجرت پر حاصل کردہ محنت کا خون نچوڑ کر اضافی قدر زائد (RELATIVE SURPULS VALUE) پیدا کرتا رہتا ہے۔

یہاں ہم نے سرمایہ کے لیے بے جان محنت کا لفظ استعمال کیا ہے دراصل یہ اشارہ ہے، بے جان

سرمایہ اور جان دار سرمایہ کی طرف (مستقل سرمایہ اور غیر مستقل سرمایہ)

یاد رہے کہ سرمایہ دارانہ فلسفہ، سرمایہ کی اس تقسیم کو نہیں مانتا کیوں کہ اس تقسیم سے سرمایہ دارانہ استحصال کا راز کھل جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ فلسفہ سرمایہ کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ اس کا کون سا حصہ جلد واپس آتا ہے اور کون سا دیر میں واپس آتا ہے۔ اور وہ اسے منقولہ اور غیر منقولہ کا نام دیتا ہے۔

بے جان سرمایہ

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ہر جنس مادہ اور محنت (سماجی معیاری لازمی محنت) سے مرکب ہوتی ہے اس لئے جنس میں جو "قدر" (VALUE) پیدا ہوتی ہے وہ صرف انسان کی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ محنت مادہ میں پوشیدہ رہتی ہے نہ وہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔ چنانچہ ہر تیار چیز کو اسی بنا پر بے جان سرمایہ (CONSTANT-CAPITAL) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مزدور نے اپنی محنت کی جو طاقت کسی مادہ پر صرف کی اس سے وہ مادہ ایک جنس بنا اور یہ جنس اب اصل میں محنت کار کی "طاقت محنت" ہے جسے بے جان سرمایہ کہا جاتا ہے۔

(CONSTANT CAPITAL) اس جنس یعنی بے جان سرمایہ سے اب اگر کوئی دوسری جنس یا اجناس تیار کی جاتی ہیں تو ان نو تیار شدہ جنسوں میں صرف اس جنس (یعنی بے جان سرمایہ) کی "قدر" (VALUE) ہی منتقل ہو گی۔ کوئی نئی قدر (NEW VALUE) نہیں پیدا ہو سکے گی۔ مثلاً ایک مزدور کی خرچ کردہ محنت کی طاقت سے کپڑا بنانے کی ایک مشین تیار ہوئی۔ یہ مشین بے جان سرمایہ ہے اور اس کی "قدر" (قیمت) کئی ہزار روپیہ ہے۔ تو اب اس مشین سے جو کپڑا تیار ہو گا اس کپڑے میں مشین کی یہ قدر ہی منتقل ہو گی۔ یہ عمل جاری رہے گا حتیٰ کہ مشین کی تمام قدر، تیار شدہ کپڑوں میں منتقل ہو جائے گی اور مشین گھس پٹ کر ناکارہ ہو جائے گی ہر مشین کا یہی حال ہے اور یہی عمل ہے۔

آلات ترقی کے ساتھ یہ ممکن ہے کہ "سماجی معیاری لازمی محنت" کا عرصہ کم سے کم ہوتا چلا جائے،

اور پرانے معیار کے بجائے نیا معیار مقرر کیا جائے۔

لیکن آلات کا ''بے جان سرمایہ'' ہونا ہر حالت میں برقرار رہتا ہے اور پیداوار کے عمل میں اس کی ''قدر'' نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے صرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔

جان دار سرمایہ

یہاں ان نئی تیار ہونے والی اجناس میں ایک اور ''قدر'' (VALUE) شامل ہوتی رہتی ہے اور وہ مشین پر کام کرنے والے مزدوروں کی ''طاقت محنت، جس سے تیار شدہ جنسوں میں نئی قدریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ جان دار سرمایہ ہے۔

یعنی زندہ سرمایہ مزدور کے کام کرنے کی طاقت ہے جسے خریدا جاتا ہے یہ محنت کی طاقت ہی جنس کے اندر وہ قدر پیدا کرتی اور اضافہ کرتی رہتی ہے جس کا نفع سرمایہ دار کی جیب میں جاتا رہتا ہے۔

پس ایک کارخانہ جو عمارتوں، مشینوں ایندھن اور خام مال وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے بے جان سرمایہ ہے اور اس میں موجود ''قدر'' جسے مزدور کی محنت کی طاقت نے ہی پیدا کیا ہے۔ نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ نیز اس کارخانہ میں اور اس کی مشینوں سے خام مال کے ساتھ جو جنس (COMMODITES) تیار ہوں گی ان میں کارخانہ کے بے جان سرمایہ (CONSTANT CAPITAL) کی مذکورہ قدر منتقل ہوتی رہے گی۔ ہاں ان تیار شدہ جنسوں میں جو نئی ''قدریں'' پیدا ہوں گی وہ اس محنت کی طاقت سے پیدا ہوں گی جو ان چیزوں کی تیاری کے وقت کارخانہ میں اور مشینوں پر کام کرنے والے محنت کاروں کے پسینے اور خون کی صورت میں خرچ ہوگئی۔ چنانچہ مزدوروں کی یہ محنت ہی جان دار سرمایہ ہے جو گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے۔

پس نام نہاد سرمایہ، چاہے زر کی صورت میں ہو، چاہے کارخانہ کی عمارت کی صورت میں، چاہے مشینوں کی صورت میں ہو، چاہے خام مال کی صورت میں ہو چاہے ایندھن وغیرہ کی شکل میں ہو محض ''بے جان'' ہے اور اس میں اتنی ہی قدر (VALUE) پائی جاتی ہے جتنی کہ ان چیزوں کی تیاری کے دوران مزدوروں کی محنت نے پیدا کی۔ یہ قدر نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے اور اس سے آئندہ جو اجناس تیار ہوں گی،

ان جنسوں میں، نام نہاد سرمایہ کی صرف وہی قدر منتقل ہوگی جو محنت کار کی محنت سے پیدا ہوئی تھی۔

حتیٰ کہ یہ بے جان سرمایہ گھس پٹ کر اور خرچ ہو کر ختم ہو جائے گا۔ البتہ تیار شدہ اجناس میں جو نئی قدریں پیدا ہوں گی۔ وہ ان محنت کاروں کی محنت کی طاقت سے پیدا ہوں گی جو تیاری کے دوران خرچ ہوتی رہے گی۔

قدر زائد

اور یہ ہی وہ قدر زائد (SURPLUS VALUE) اور اضافی قدر زائد (RELATIVE SURPLUS VALUE) ہے جسے نام نہاد سرمایہ کا نفع کا نام دے کر سرمایہ ہڑپ کر جاتا ہے۔

دست کاری

آیئے! اس بات کو ایک اور زاویہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

حرفت، یعنی دست کاری کا آغاز محنت کار کے بڑھتے ہوئے شعور اور انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر ہوا۔ یہ آغاز کس طرح ہوا اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

انفرادی دستکاری

اتنا جان لینا چاہیئے کہ دست کاری (حرفت) کا آغاز انفرادی حیثیت سے ہوا اور ہر دست کار تنہا کام کرتا تھا۔

دست کاری سے اس کا مقصد صرف اپنے استعمال کے لیے اور اپنی گذر بسر کے لیے چیزیں بنانا ہوتا تھا۔

مجرد تجارتی مقصد یا منافع حاصل کرنے کے لیے دست کار دست کاری نہیں کرتا تھا۔

انفرادی دست کاری کی جھلک آج بھی کہیں کہیں دیہات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

انفرادی دست کاری کی خصوصیات یہ ہیں کہ

دست کار جو چیز بناتا مکمل بناتا تھا۔ اپنے طریقہ پیداوار پر حاوی رہتا تھا اور اپنی تیار کردہ چیز کا

مالک ہوتا تھا۔

اجتماعی دست کاری

مشین کی ایجاد کے بعد جب سرمایہ داری کا دور آیا، تو دستکاری اجتماعی ہوگئی۔

یعنی اب ایک جنس کی تیاری جزاً جزاً شروع ہوئی۔ اور دست کار ''کل'' کی بجائے فقط ایک ''جز'' بن کر رہ گیا۔

مثلاً ایک بڑھئی انفرادی دست کار کی حیثیت سے پہلے الماری، کرسی، میز پوری کی پوری خود تیار کرتا تھا اور اس کا مالک ہو جاتا تھا۔

لیکن اجتماعی دست کاری میں ایک میز، ایک کرسی ایک الماری وغیرہ کئی دستکار مل کر اس طرح بناتے ہیں کہ ایک دست کار صرف لکڑی کے تختے چیر رہا ہے، ایک صرف پائے بنا رہا ہے اور ایک صرف درازیں تیار کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح باہم مل کر جو چیز یہ سب دست کار بنا رہے ہیں وہ خود اب اس کے مالک نہیں ہیں بلکہ سرمایہ دار اس چیز کا مالک بن گیا ہے۔

حق ملکیت

حالانکہ پہلے جب طریق دست کاری انفرادی تھا تو تیار چیز کا مالک تیار کرنے والا دست کا ہوتا تھا۔

اب جب کہ طریق پیداوار اجتماعی ہو گیا ہے تو حق وانصاف کی رو سے تیار چیز کی ملکیت بھی تیار کرنے والے دست کاروں کی اجتماعی ہونی چاہیئے۔

لیکن اب سرے سے تیار کرنے والے ہاتھ مالک ہی نہیں ہو پاتے بلکہ ایک غیر ہاتھ، سرمایہ، کے نام پر مالک بن جاتا ہے۔

دو خاص باتیں

اجتماعی دست کاری کے عمل میں دو اور خاص باتیں ظہور میں آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جو جنس ایک دستکار کے لیے تیار مال ہے دوسرے دست کار کے لیے وہ خام مال بن جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک دستکار کا کام جہاں ختم ہوگا دوسرے دست کار کا کام وہاں سے شروع ہوگا۔اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک الماری بناتے وقت ایک دست کار لکڑی کے تختے بناتا ہے تو یہ تختے اس دست کار کی تیار کردہ جنس ہے یہاں اس دست کار کا کام ختم ہو گیا۔اب دوسرا دست کار ان تختوں کو دراز میں فٹ کرتا ہے تو اس دوسرے دستکار کے لیے یہ تختے خام مال ہوئے اور اس کا کام ان تختوں سے شروع ہوا اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اجتماعی دستکاری میں طاقت محنت زیادہ خرچ آتی ہے

اجتماعی دست کاری، انفرادی دست کاری سے زیادہ چستی کی طالب ہوتی ہے اس طرح اجتماعی دست کاری، دست کار کی دست کاری کو محدود بھی کر دیتی ہے۔اور اس کی محنت کی طاقت زیادہ سے زیادہ صرف بھی کرا دیتی ہے۔

چنانچہ جنس تعداد میں بہت اور صفائی میں بہتر تیار ہوتی ہے جب کہ وقت بہت کم صرف ہوتا ہے۔

زائد محنت کا نفع سرمایہ دار کی جیب میں

سرمایہ دار اس صورت حال سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرتا ہے وہ دست کار کو اجرت صرف شدہ وقت کے مطابق دیتا ہے حالانکہ اتنے وقت میں دست کار کی ''طاقت محنت'' بہت زیادہ خرچ ہوتی ہے تو سرمایہ دار جو زیادہ نفع اس طرح کماتا ہے وہ مزدور کی پیدا کردہ ''قدر زائد'' ہی ہوتا ہے بلکہ مارکیٹ میں پہنچ کر اس قدر زائد پر اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے جو ''اضافی قدر زائد'' ہوتی ہے ان تمام قدروں کا نفع سرمایہ کی جیب کھینچ لیتی ہے۔

اجتماعی دستکاری میں دستکار غلام بن جاتا ہے

اجتماعی دست کاری میں سرمایہ دار کا یہ عمل بہت سی تبدیلیاں لے آتا ہے۔ وہ دست کار جو انفرادی دست کاری میں کسی چیز کو مکمل طور پر تیار کرسکتا تھا اب صرف اس چیز کا ایک حصہ تیار کرسکتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی صلاحیت اس حصہ کی تیاری تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور پھر یہ محدود صلاحیت بھی کارخانہ کی حد میں محصور رہتی ہے۔ باہر اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح دستکار کارخانہ دار کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔

جسمانی محنت اور دماغی عمل کی تفریق

لیکن معاملہ اسی پر بس نہیں ہو جاتا بلکہ اس عمل کی جاری رہنے سے رفتہ رفتہ دماغی کام اور دستکاری ہی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ ایک طبقہ دماغی محنت کے لیے خاص ہو جاتا ہے جسے تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے اور ایک طبقہ جسمانی محنت کرنے والا رہ جاتا ہے جو مزدور کہلاتا ہے۔

اس تفریق و تقسیم سے ایک طرف علم و ذہن بھی سرمایہ دار کی نفع اندوزی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور دوسری طرف مزدوروں کی جسمانی اور فنی محنت بھی اس کے حصول نفع کا آلۂ کار بنی رہتی ہے۔

معاشرہ میں طبقاتی تقسیم

اجتماعی دست کاری کی اس تقسیم سے سماج میں مختلف طبقات بنتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ طبقہ واریت سماجی زندگی کا ہمہ گیر اور اٹل قانون بن جاتی ہے۔

اس سماج میں تمام ایجادات سائنسی اور ٹیکنیکی ترقیاں، سرمایہ داریت کے فروغ و استحکام کا ذریعہ بنتی رہتی ہیں۔

ماضی کے غلام دارانہ سماج میں غلام زنجیروں میں جکڑ کر رکھے جاتے تھے جاگیردارانہ سماج میں کاشت کار جاگیردار کی ملکیت کا ایک جز ہوتا تھا۔ ان دونوں سماجوں کے عہد میں غلام اور کسان کی غلامانہ اور محتاجانہ پوزیشن صاف صاف نظر آتی تھی۔

فریب نظر

لیکن موجودہ سرمایہ دارانہ سماج میں ظاہر داری کے طور پر مزدور اور محنت کار آزاد نظر آتا ہے مگر وہ سرمایہ داروں کے قدموں کے ساتھ ایسے مخفی تاروں سے بندھا ہوا ہوتا ہے جنہیں وہ بیچارا خود دیکھ نہیں پاتا۔

ہر حیثیت سے وہ اتنا مجبور بنا دیا جاتا ہے کہ سرمایہ دار کی منشا اور لوٹ کھسوٹ کے دائرے سے الگ ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کے باوجود قانونی مغالطّوں کے چکر اور سرمایہ دار مالکوں کی ادلا بدلی کے عمل سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مزدور آزاد ہے۔ حالانکہ وہ شاید سانس بھی آزادی سے نہیں لے سکتا۔ اس کی ہر سانس سرمایہ دارانہ پیداوار کے لیے پابند کر دی گئی ہے۔

اجرت کی تلاش اور اجرت کے لیے دست درازی کے سوا محنت کار اور کچھ کر ہی سکتا۔

چاہے اسے موجودہ سماج میں کتنے ہی قانونی حقوق و تحفظات مہیا کر دیے گئے ہوں۔

بیروزگاری

اس پر مستزاد یہ ہے کہ نئی نئی مشینوں کی ایجاد اور ترقی نے نہ صرف یہ کہ مزدور کی ’’مدت محنت‘‘ کو کم سے کم کر دیا ہے بلکہ مزدور کی ضرورت کو بھی زیادہ سے زیادہ گھٹا دیا ہے۔

اس سے بیروزگاری کا سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

صحت اور توانائی کا مسلسل ضیاع

مشینوں کی نت نئی ایجادوں اور ترقیوں کا یہ بھی نتیجہ نکلا ہے کہ ان پر کام کرنے والے مزدور یا کارکن کو انتہائی تیزی اور مستعدی سے کام کرنا ہوتا ہے کم سے کم وقت میں، اسے زیادہ سے زیادہ اپنی محنت کی طاقت خرچ کرنا پڑتی ہے جس کا انجام اسے یہ بھگتنا پڑتا ہے کہ وہ بہت جلد کام کرنے کی قوت کھو دیتا ہے

اور بوڑھا ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ طبعی عمر سے بہت قبل موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔

عام نتائج

مذکورہ بالا توضیحات سے یہ بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ سرمایہ کیا ہے اور سرمایہ کی دولت کا اکتناز و اجتماع کس طرح ہوتا ہے۔ انسانی محنت کا استحصال کیسے کیسے کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں، مزدور، کسان اور عام آدمی کن کن مصائب اور پابندیوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے کاروباری سرمایہ میں اضافہ کی قوت بڑھتی ہے بے روزگاری بھی زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے اور افلاس عام ہونے لگتا ہے۔

غرضیکہ سرمایہ کی بڑھوتری، مزدور طبقہ کی غربت اور بے کاری میں اضافہ کا ایک اٹل قانون اور بنیادی سبب ہے۔

سرمایہ مزدور کی قدر زائد سے جنم لیتا ہے اور اس سرمایہ میں اضافہ بھی اس قدر زائد کے بار بار استحصال سے ہوتا رہتا ہے۔

چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام، محض مزدوروں کی محنت کے استحصال کی اساس پر قائم ہوا اور قائم رہ سکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام، محض مزدوروں کی محنت کے استحصال کی اساس پر قائم ہوا اور قائم رہ سکتا ہے۔

دراصل سرمایہ دار صرف اسی کام میں سرمایہ لگاتا ہے جس میں اسے زیادہ سے زیادہ نفع کی توقع ہوتی ہے۔

وہ انسانوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر اجناس تیار نہیں کراتا۔

سرمایہ دارانہ ذہنیت

سرمایہ دارانہ نظام کا پہلا اصول کاروبار میں نفع اور پھر نفع کے تناسب کو دیکھنا ہے۔

یعنی جو کاروبار شروع کیا جائے وہ نفع بخش ہو اور زیادہ سے زیادہ نفع آور بنا رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اجناس زیادہ تیار کی جانے لگتی ہیں کہ ان میں نفع زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض اجناس کم تیار کی جاتی ہیں کہ ان میں نفع کم نظر آتا ہے اور بعض اجناس کی تیاری روک دی جاتی ہے کہ ان میں نفع نظر نہیں آتا یا بہت ہی قلیل نفع رہ جاتا ہے۔

یوں اجناس کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور بسا اوقات بعض اجناس کم یاب ہو جاتی ہیں۔

سرمایہ مقدار کے اختلاف کے علاوہ اپنی ترکیبی ساخت (COMPOSITION ORGANIC) کی نوعیت میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

سرمایہ کا ایک جز، عمارت، مشین، آلات وغیرہ ہوتے ہیں اور دوسرا جز محنت کاروں کی تعداد ہوتی ہے۔

پہلا جز بے جان سرمایہ ہے اور دوسرا جز جاندار سرمایہ ہے کسی کاروبار میں جز زیادہ ہوتا ہے اور دوسرا کم، اور کسی کاروبار میں دوسرا جز زیادہ ہوتا ہے اور پہلا کم۔

سرمایہ میں قدر زائد (SURPLUS VALUE) مزدور کی محنت سے ہی پیدا ہوتی ہے، اس لیے وہ کاروبار جس میں جاندار سرمایہ (مزدور) زیادہ ہے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں، سرمایہ داروں کے درمیان جو جدوجہد اور تگ و دو بلا لحاظ اس کے کہ سرمایہ کی ترکیبی ساخت کیسی ہے یعنی جاندار سرمایہ زیادہ ہے یا بے جان سرمایہ زیادہ ہے منافع کی شرح کو یکساں بنا دیتی ہے اگر سرمایہ کی مقدار برابر ہے۔

''سرمایہ داری اور اشیا کی خرید و فروخت''

سرمایہ دارانہ سماج میں اشیا اپنی اصل قدر کے برابر فروخت نہیں ہوتیں بلکہ اس لاگت کے ارد گرد ان کی قیمت فروخت گھومتی رہتی ہے جو سرمایہ کی صورت میں خرچ ہوتی ہے۔

لاگت

لاگت کا مطلب یہ ہے وہ رقم جو کسی جنس کے پیدا کرنے پر خرچ آئے اور وہ اوسط منافع جو اس رقم پر رائج ہو صرف کردہ سرمایہ اور اس کے اوسط منافع کے مجموعہ کو سرمایہ لاگت کے طور پر مقرر کرتا ہے۔

لیکن غور کیجئے کہ یہ لاگت مستقبل کوئی چیز نہیں ہے بلکہ جنس کی ''قدر'' (VALUE) ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔

اس لئے کہ لاگت کے گھٹنے اور بڑھنے کا دارو مدار جنس کی ''قدر'' (VALUE) ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔

منافع کی اوسط شرح میں کمی بیشی

اور چونکہ سرمایہ دار کا مقصد کاروبار سے نفع حاصل کرنا ہوتا ہے چنانچہ جیسے جیسے سرمایہ دارانہ کاروبار بڑھے گا اور پھیلے گا منافع کی اوسط شرح گھٹتی چلی جائیگی۔

شرح منافع کی کمی کا سرمایہ دارانہ علاج

سرمایہ دار منافع کی اوسط شرح گرنے کی تلافی، مزدوروں کے مزید استحصال سے کرتا ہے اس کے سوا اور کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ وہ اجرتوں میں کمی کرے گا یا کام تیزی سے لینا چاہے گا یا اور زیادہ بہتر مشین کے ذریعہ، کم سے کم مزدور رکھ کر اجناس تیار کرے گا۔

تضادات کی پیدائش

اس سے مزدور طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ کے درمیان بے شمار تضادات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔
سرمایہ دارانہ نظام میں جتنی ترقی ہوگی شرح منافع کی اوسط اسی تناسب سے گرتی جائے گی۔ اس

کے ازالہ کا آخری چارہ کار سرمایہ دار اپنے گٹھ جوڑ سے کرتا ہے مختلف انڈسٹریز کو ایک دوسرے میں مدغم کرلیا جاتا ہے۔ٹرسٹ وغیرہ بنالئے جاتے ہیں حتیٰ کہ حکومت کی سرپرستی حاصل کی جاتی ہے۔

یہ چارہ کار بھی محض عارضی ہے تضادات اور اقتصادی بحران یکے بعد دیگرے پیدا ہوے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار بالکل برہنہ ہوکر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

تجارت

سرمایہ دارانہ نظام میں اجناس فوری استعمال کے لیے تو بنائی نہیں جاتیں۔ بلکہ اصل مقصد ان پر منافع حاصل کرنا ہوتا ہے۔چنانچہ اجناس کی تیاری کے بعد ایک اور منزل ہے یعنی ان کی فروخت جس کے بعد ہی سرمایہ دار کے پاس اس کی رقم واپس ہوگی اور منافع حاصل ہوگا۔اس کے لیے سرمایہ دار اتنا انتظار نہیں کرتا ہے یا کرسکتا ہے کہ ضرورت مند خریدار اس کے پاس آئے اور جنس خریدے بلکہ وہ کسی تاجر تجارتی ادارہ کو اپنی اجناس فروخت کر دیتا ہے اور یہ تاجران اجناس کو ضرورت مند خریداروں تک پہنچانے اور فروخت کرنے کا انتظام کرتا ہے۔

تجارتی نفع

کارخانہ دار اس مقصد کے لیے تیار شدہ اجناس کی قدر زائد کا ایک حصہ ان تاجروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے تا کہ وہ اسے فروخت کر کے قدر زائد کے اس حصہ کو بطور نفع حاصل کرلیں۔

تجارتی سرمایہ کاری کا عمل

یہاں سے تاجرانہ سرمایہ عمل شروع ہوتا ہے۔

اب تاجر کارخانوں کی تیار کردہ اجناس ہی کے فروخت کا انتظام نہیں کرتا۔ بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے کاریگروں اور پیدا کنندہ گان کا مال بھی خرید کر ادھر اُدھر پہنچانے کا انتظام کرتا ہے تاجران کاریگروں سے

بڑی تعداد میں مال خرید لیتا ہے۔اور اکثر اوقات پیشگی رقم دے کر ان سے مال تیار کروالیتا ہے۔

لیکن کاریگروں کو جو قیمت وہ ادا کرتا ہے وہ اجناس کی اصل قدر سے کم اور بہت کم ہوتی ہے جب کہ تاجر،ضرورت مند خریداروں سے اجناس کی پوری پوری ''قدر''(VALUE)وصول کر لیتا ہے۔

کاریگروں کی بے کاری

اس طرح رفتہ رفتہ چھوٹے چھوٹے کاریگروں کی حالت خستہ ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنی محنت اور فن کی پوری قیمت کبھی وصول نہیں کر پاتے بلکہ آخر میں بیروزگاری کا شکار ہو کر مزدوری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سٹہ بازی

پھر تجارت میں نفع اندوزی کے لیے ''سٹہ'' کا عمل چلتا ہے چیزیں ابھی پیدا نہیں ہوتی ہیں کہ تاجروں اور تجارتی کمپنیوں کے درمیان ان کی مصنوعی اور پیشگی تجارت شروع ہو جاتی ہے۔

تھوک فروش سوداگران اور خردہ فروش سوداگران کے طبقے بن جاتے ہیں آڑھت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ایک جنس استعمال کنندگان کے ہاتھوں تک پہنچے سے پہلے بکتی ہوئی بے شمار ہاتھوں سے گذرتی ہے۔اس خرید و فروخت میں حصہ لینے والوں میں اکثریت ایسے تاجروں کی ہوتی ہے جنہوں نے اپنا سودا کبھی دیکھا تک نہیں ہوتا۔محض رسیدیں فروخت ہوتی رہتی ہیں اور حق ملکیت منتقل ہوتا رہتا ہے۔

سٹہ بازی کا نفع بھی کروڑ ہا آدمیوں کی اس محنت کے نقصان سے ہی ترتیب پا کر حاصل ہوتا ہے جو اجناس کی پیداوار میں صرف ہوئی ہے۔

سود اور بینک

سٹہ بازی کے ساتھ سودی لین دین کا عمل بھی سرمایہ دارانہ نظام میں رائج ہوتا ہے۔

بینک سودی لین دین کا سب سے بڑا ذریعہ میں جہاں سے سرمایہ دار قرض پر سرمایہ حاصل کرتا ہے یعنی بینک سرمایہ کی تجارت کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ سود خور ساہوکاروں اور بینکوں کے پاس سود لینے اور سود دینے کا روپیہ کہاں سے آتا ہے۔

خود روپیہ، یا سونا، چاندی، تو یہ روپیہ پیدا نہیں کرتے یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ بڑھانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ پیداواری عمل کے ذریعہ اضافہ کیا جائے۔

بینک بھی اسی طرح روپیہ میں اضافہ کر کے سود ادا کرتے ہیں اور سود خور ساہوکار بھی لوگوں سے جو سود وصول کرتا ہے وہ بھی پیداواری عمل کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔

یہ پیداواری ہی عمل مزدور اور کسان کی محنت پر مبنی ہے۔

چنانچہ سود خور ساہوکار ملنے والا سود اور بینکوں کے ذریعہ ادا کیا جانے والا اور حاصل کیا جانے والا سود، سب ہی مزدور اور کسان کی محنت سے جاری پیداواری عمل کا ثمر ہے۔

سودی سرمایہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس سرمایہ کا اصل مالک اسے پیداواری عمل میں لگاتا ہے اور پھر یہ نیا شخص اپنے منافع کا ایک حصہ سود خود ساہوکار کو یا بینک کو بطور معاوضہ ادا کرتا ہے۔ سرمایہ استعمال کرنے والے شخص کے پاس یہ سرمایہ کہاں سے آیا؟ ظاہر ہے کہ وہ مزدور کی محنت سے پیدا شدہ (SURPLUS VALUE) ہی ہے۔

چنانچہ ساہوکار یا بنک کو ادا کیا جانے والا سود، مزدور کی محنت کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے اور چونکہ سود کی شرح بدلتی رہتی ہے اس لئے قدر زائد پر دباؤ میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

نیز سرمایہ کی قیمت بھی ''رسد و طلب'' کی کمی بیشی کے ساتھ کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔

حاصل گفتگو

یہاں تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کی تشکیل، سرمایہ کا نفع تجارتی منافع، سود وغیرہ سب ہی اس قدر زائد کا حصہ ہوتے ہیں جو مزدور کی محنت کی طاقت سے اجناس کی تیاری کے دوران پیدا ہوتی ہے۔

زراعت کاری

اب ہم زراعت کاری کا تجزیہ کرتے ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس شعبہ میں لگان وغیرہ کی صورت میں نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ وہ کہاں سے آتا ہے؟

زمین کی حیثیت

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ

''زمین'' جنس نہیں ہے اس لئے کہ یہ انسان کی محنت سے تخلیق نہیں ہوئی ہے اور اسی لیے زمین میں کوئی ''قدر'' (VALUE) نہیں ہوتی۔ زمین کو کوئی انسان یا طاقت نہ گھٹا سکتی ہے نہ بڑھا سکتی ہے۔ زمین کی محض قیمت (PRICE) ہوتی ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اس پر زمینداروں کی اجارہ داری قائم چلی آ رہی ہے۔

زمین کی ملکیت

سرمایہ دارانہ سماج میں زمین بھی انفرادی ملکیت میں ہوتی ہے اکثر بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار اس پر قابض ہوتے ہیں جو زمینوں پر خود کام نہیں کرتے بلکہ بٹائی، لگان یا ٹھیکہ پر زمین دے دیا کرتے ہیں۔

زرعی اور صنعتی اجناس کی قیمتیں

صنعتی اجناس کی قیمتیں تو اپنی اوسط لاگت کے مطابق مقرر ہوا کرتی ہیں لیکن زرعی اجناس کی قیمتیں اوسط لاگت کے مطابق نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ لاگت کے مطابق مقرر ہوتی ہیں۔

زمینداری اور سرمایہ داری کا فرق

زمینوں کی ملکیت کے بارے میں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ:۔
زمین پر زمیندار کی ملکیت اور اجارہ داری کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ سرمایہ داری کا باہم مقابلہ ممکن ہے۔
ایک فیکٹری کے مقابلہ میں دوسری فیکٹری کھولی جاسکتی ہے لیکن ایک زمین کے مقابلہ میں دوسری زمین پیدا نہیں کی جاسکتی اس لئے زمیندار کو سرمایہ دار کے مقابلہ میں زیادہ تحفظ اور تفوق حاصل ہوتا ہے۔
زمیندار اپنی اس حیثیت سے خوب واقف ہوتا ہے اور اس حیثیت کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔
زمین پر زمیندار کے اجارہ دارانہ قبضہ کی یہ حیثیت، سرمایہ دار کو صنعت سے زراعت کے شعبہ میں آنے سے مانع بن جاتی ہے۔

زراعت صنعت کے مقابلہ میں ہمیشہ پس ماندہ رہتی ہے

اوراسی لئے زراعت ہمیشہ صنعت کی نسبت پس ماندہ رہتی ہے نیز زراعتی ترکیبی ساخت میں ہمیشہ صنعتی سرمایہ کی ترکیبی ساخت سے نیچا رہتا ہے۔
اس کا مطلب یہ ہوا کہ زراعتی سرمایہ صنعتی سرمایہ کے مقابلہ میں قدر زائد (SURPLUS VALUE) زیادہ وصول کرتا ہے۔

کسانوں کا استحصال

چنانچہ زمین کی یہ حیثیت ہی کسانوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر شرط پر کاشت کے لیے زمیندار سے زمین حاصل کریں۔
اب اس زمین میں کسان محنت کرتا ہے اور اس محنت کا حاصل ہی بٹائی، لگان ٹھیکہ وغیرہ کی شکل میں ادا ہوتا ہے۔
چنانچہ زمین کا تمام لگان ''قدر زائد'' (SUR PLUS VALUE) ہے جو محنت زائد کی

پیداوار ہے۔

اور کسانوں کا استحصال اگرچہ صنعتی مزدوروں کے استحصال سے صورتاً ذرا مختلف ہے مگر حقیقتاً دونوں کا استحصال یکساں ہے۔

تکرار پیداوار کا عمل

اگر ایک طرف گندم اور چاول وغیرہ ہر روز خرچ ہوتے رہتے ہیں تو دوسری طرف کھیتوں میں ان کا کاشت بھی ہوتی رہتی ہے۔ کپڑے جوتے اور برتن وغیرہ اگر ایک طرف استعمال ہوکر پھٹتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں تو دوسری طرف کارخانوں اور درزی خانوں وغیرہ میں نئے کپڑے اور جوتے برتن وغیرہ بنانے کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔ غرضیکہ خرچ اور پیداوار کی یہ تکرار ہر شعبہ میں جاری رہتی ہے۔ چیزیں تیار ہوتی رہتی ہیں۔ چیزین خرچ ہو جاتی ہیں۔ چیزیں پھر تیار ہونے لگتی ہیں اشیا کا یہ وصف ''پیداوار کے عمل کی تکرار کہلاتا ہے۔

اس وصف کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

سادہ تکرار پیداوار

پیداواری عمل کی یہ تکرار اگر اس طرح جاری ہو کہ سال میں ایک مقررہ مقدار یا تعداد میں اشیا تیار کی جاتی ہیں تو یہ ''پیداواری عمل کی سادہ تکرار ہے۔

وسیع تکرار پیداوار

لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اشیا زیادہ سے زیادہ پیدا کی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جا سکے۔ اس صورت میں اشیا کی پیداوار اور مقررہ تعداد یا مقدار میں نہیں ہوا کرتی اسے ''پیداواری عمل کی وسیع تکرار کہا جاتا ہے۔

پیداوار کا تکراری عمل اور سماجی تعلقات

اور یہ سرمایہ دارانہ نظام کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے اس صورت حال سے سماجی تعلقات میں بھی آئے دن تجدید ہوتی رہتی ہے اور تکرار و تجدید کا یہ عمل ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رہتا ہے۔

پیداواری عمل کی وسیع تکرار سے جہاں اشیا سال بہ سال زیادہ تعداد اور مقدار میں تیار ہوتی رہتی ہیں وہاں سال بہ سال کارخانوں، مشینری اور خام مال کی تعداد و مقدار بھی بڑھتی رہتی ہے اور اسی تناسب سے محنت کاروں اور ان کے کاموں میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اور پھر یہ ہی صورت حال سرمایہ دار طبقہ کے افراد کے درمیان تعلقات میں تبدیلیاں بھی لاتی رہتی ہے۔

سماجی تعلقات میں تضادات

اس طرح نہ صرف مزدور سرمایہ دار کے درمیان تضادات بڑھتے رہتے ہیں بلکہ خود سرمایہ دار گروہ کے درمیان تضادات کا شدید اضافہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹے کارخانے بڑے کارخانوں کے مقابلہ میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بینک بڑے بینکوں کے مقابلہ میں فیل ہونے لگتے ہیں۔ بڑا سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ دار کے سرمایہ پر قابض ہو جاتا ہے اس طرح سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی ترقی بتدریج اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہتی ہے گویا۔

"مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

سرمایہ میں اضافہ کا عمل

یہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کی ایک اور خصوصیت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ ہر سرمایہ دار اپنے منافع کو (جو مزدور کی محنت کی "قدر زائد کا وہ حصہ ہے جسے سرمایہ دار مزدور کو نہیں دیتا) سارا کا سارا اپنے عیش و آرام پر خرچ نہیں کرتا بلکہ مستقبل کے نقصان کے خوف سے دوسرے سرمایہ دار حریفوں کی مسابقت

کے اندیشے سے اور آئندہ زیادہ منافع حاصل کرنے کے لالچ میں اپنے نفع کا کچھ سابقہ سرمایہ میں شامل کرتا چلا جاتا ہے۔

اکتناز سرمایہ (CENTRALIZATION OF CAPITAL)

سرمایہ دار کا یہ عمل ''اکتناز'' کہلاتا ہے یعنی پیداواری عمل کی وسیع تکرار بجائے خود مجبور کرتی ہے کہ ''اکتناز'' جاری رکھا جائے اور یہ اکتناز درحقیقت محنت کاروں کی وہ قدر زائد ہی ہوتی ہے جسے محنت کاروں نے پیدا کیا تھا مگر سرمایہ دار نے اسے مزدوروں کو نہیں دیا اپنا نفع بنالیا اور اب اسے سرمایہ کی شکل دے دی۔

ادغام سرمایہ (CONCENTRATION OF CAPITAL)

بعض حالات میں اکتناز سرمایہ (CENTRALIZATION OF CAPITAL) کا یہ عمل سٹاک کمپنیوں، مالی کار پور یشنوں وغیرہ کی شکل میں سرمایہ کے ادغام (CONCENTRATION OF CAPITAL) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح سرمایہ کاری کا یہ عمل ایک طرف دولت کے انبار لگا تا رہتا ہے جس پر صرف مٹھی بھر لوگ قابض ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان محنت کاروں کو ہر طرح محروم بنا دیا جاتا ہے جن کی محنت سے پیدا شدہ قدر زائد استحصال کے ذریعہ اب دولت کے انبار کی شکل میں ان سرمایہ داروں کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔

انفرادی ملکیت کی تبدیلی

فرد کی جداگانہ محنت سے پیدا شدہ انفرادی ملکیت، سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دارانہ انفرادی ملکیت میں بدل جاتی ہے۔ پہلی انفرادی ملکیت کی اساس ایک شخص کی اپنی محنت سے پیدا شدہ اس کی ملکیت پر تھی لیکن سرمایہ دارانہ انفرادی ملکیت دوسروں کی اس محنت کی اساس پر قائم ہوتی ہے جس محنت کی پیداوار پر محنت کرنے والے کی ملکیت نہیں رہتی۔ بلکہ معاوضہ پر محنت کرانے والے (یعنی سرمایہ دار) کی ملکیت بن جاتی ہے۔

تبدیلی کا یہ عمل پرانی سماج کو متزلزل کر دیتا ہے اور نئی سماج قائم ہونے لگتی ہے۔

محنت کار حیثیت

چنانچہ پہلے محنت کار اپنی محنت سے پیدا کردہ چیز کا خود مالک ہوتا تھا۔لیکن اب وہی محنت کار اجرتی مزدور(PROLETARIAN) بن جاتا ہے اور اس کے آلات محنت اور محنت کے وسائل ''سرمایہ'' بننے لگتے ہیں۔

بے دخل

اس مرحلہ پر پیداوار کا عمل اجتماعی ہو جاتا ہے۔ پہلے قسم کی انفرادی ملکیت بالکل ختم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کوئی محنت کار اپنے لیے محنت کار نہیں رہتا۔اور اس کی بے دخلی مکمل ہو جاتی ہے۔لیکن بے دخلی کا یہ عمل بند نہیں ہوتا اور اب اس رخ ''سرمایہ کے ادغام'' کی طرف ہو جاتا ہے۔اب ایک سرمایہ دار دوسرے سرمایہ دار کو تباہ کرنے میں لگ جاتا ہے۔

محنت کے عمل میں منظم اتحاد

ایک سرمایہ دوسرے سرمایہ میں مدغم ہونے لگتا ہے اور اس ادغام کے ساتھ محنت کے عمل میں اتحاد کار بہت بڑے پیمانہ پھیل جاتا ہے۔سائنسی طریقے زیادہ سے زیادہ عام ہو جاتے ہیں فنی شعور میں بہت ترقی ہو جاتی ہے۔

زراعت منظّم ہو جاتی ہے ذرائع پیداوار کے اشتراک واجتماع سے محنت کا خرچ کم ہونے لگتا ہے عالم گیر خرید وفروخت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور بازار ومقابلہ کی کشمکش تیز ہو جاتی ہے۔

عوام پر اس کے اثرات

اب اس کا دوسرا پہلو سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ عوام کی بدحالی اور افلاس میں تیزی سے اضافہ ہونے لگتا ہے چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کی مرکزیت و عالم گیریت اگر ایک طرف سرمایہ کو صرف چند ہاتھوں میں محدود کردیتی ہے تو دوسری طرف محنت کا رطبقہ کو اجتماعی محنت کے عمل کی وجہ سے متحد و منظم بنا دیتی ہے۔

ردعمل

اور سرمایہ دارانہ اجارہ داری، ذرائع پیداوار کے ارتکاز اور محنت کی نئی اجتماعی سماجی تشکیل کی وجہ سے اتنی پھولتی پھیلتی جاتی ہے کہ بڑھا ہوا اور بڑھتا ہوا سرمایہ بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں سے سرمایہ دارانہ انفرادی ملکیت کے تاریخی زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔

سرمایہ داریت کے مراحل

غور کیجئے سرمایہ داریت، پیداوار اور مزید پیداوار کے عمل میں کن کن مراحل سے گزرتی ہے۔

اولاً:۔ پیداواری کے ذرائع اور محنت کی طاقت فراہم کرنا ہوتا ہے

ثانیاً:۔ پیداواری کا عمل جاری کرنا پڑتا ہے۔

ثالثاً:۔ تیار مال کو فروخت کر کے، لاگت کی وصول یابی کا انتظام کرنا ہوتا ہے

اس مثلث میں پہلا اور تیسرا مرحلہ بجائے خود کچھ نہیں ہوتا۔ محض عمل کی ایک گردش ہے۔ یعنی پہلے مرحلہ میں سرمایہ دار نے اجناس کی تیاری کے لیے اپنا روپیہ لگایا اور تیسرے مرحلہ میں ان اجناس کو فروخت کر کے اپنا روپیہ نفع کے ساتھ واپس لے لیا۔

اصل چیز

بنیادی چیز دراصل دوسرا مرحلہ جس میں پیداواری عمل انجام پایا اور مزدور نے اپنی محنت کی طاقت

سے اجناس میں قدر زائد (SURPLUS VALUE) پیدا کی۔

بہر حال یہ ہی وہ تین مرحلے ہیں جن کی تکرار ہر سرمایہ دار کرتا ہے اور ایک کا سرمایہ دوسرے کے سرمایہ کی کاٹ میں لگا رہتا ہے۔

سماجی سرمایہ

سرمایہ کی یہ حرکت جو اولاً منفرد صورت میں کشمکش کے دور سے گزرتی ہے ار پھر باہم مل کر پیداواری عمل کی تکرار کو زندہ رکھتی ہے سماجی سرمایہ ہوتی ہے۔

اور سرمایہ دارانہ نظام کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ سماجی سرمایہ کی گردش اور اس کے ذریعہ پیداوار کے عمل تکرار جاری رہے۔

سماجی سرمایہ کی گردش اور پیداواری عمل کی تکرار میں اضافہ سے پیدا ہونے والا بحران

مگر یہ ہی ضرورت آگے چل کر، جب سماجی سرمایہ کی گردش بہت بڑھ جاتی ہے اور پیداواری عمل کر تکرار میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے تو اقتصادی بحران کا روپ دھارنے لگتی ہے۔ اور پیداوار کا سماجی عمل، درہم برہم ہونے کے قریب آ جاتا ہے۔ یہ ایسا تضاد ہے جن سے سرمایہ دارانہ نظام کسی طرح خود کو محفوظ نہیں کر سکتا۔

دراصل سرمایہ دارانہ نظام کے زوال کا راز، سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے اس رجحان میں ہی پوشیدہ ہے جس کا تقاضا ہے کہ صنعت کاری کو وسیع و لامحدود بنایا جائے۔

پیداوار بڑھانا، زیادہ سے زیادہ پیداوار بازار میں لانا جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ اسے فروخت کرنا یہ سرمایہ داریت کے لازم اجزا اور شرائط ہیں۔

اور ان کا نتیجہ ہی وہ اقتصادی بحران ہیں جو انجام کار ہر سرمایہ دارانہ تنظیم کو پیش آ کر رہتے ہیں۔

افراط جنس یا افراط زر

پیداوار کے عمل کی مسادتکرار چاہتی ہے کہ سال بھی کی پیداوار میں لگا ہوا سرمایہ واپس آ جائے تا کہ دوسرے سال اس عمل کی تکرار جاری رہ سکے۔

اور پیداوار کے عمل کی وسیع تکرار چاہتی ہے کہ پیداوار جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے اور پھر جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ فروخت ہوتی رہے تا کہ لاگت واپس آ کر عمل کی یہ وسیع تکرار جاری رکھے۔ پیداواری عمل کی ان دونوں صورتوں کے ہر تقاضے بجائے خود اس انتہا کو پہنچیں گے۔ ''افراط جنس'' پیدا ہو جائے گی یا افراط زیادہ دونوں صورتیں یا پھر ان کے برعکس۔

گرانی، بیروزگاری اور افلاس

اور دوسری طرف محنت کار طبقہ بے روزگاری اور افلاس کا شکار ہوگا۔ عوام گرانی اور نایابی کی شکل میں مبتلا ہو جائیں گے انجام کار اس بحران کا نتیجہ یا تو بدامنی کی شکل میں نکلے گا یا جنگ کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

بنیادی تضاد

اس طرح یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سرمایہ دارانہ نظام کا اصل اور بنیادی تضاد یہ ہے کہ طریق پیداوار تو اجتماعی ہے لیکن ملکیت کا طریقہ انفرادی ہے اور یہ سرمایہ دارانہ نظام کا ایسا تضاد ہے جسے نہ تو دور کیا جا سکتا ہے نہ اس کا کوئی حل نکالا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پیداوار کے امکانات جتنے زیادہ بڑھتے اور لامحدود ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی زیادہ عوام کی قوت خرید کمزور اور مفلوج ہوتی رہتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اقتصادی بحرانوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے طبقاتی تضاد یعنی غریب عوام اور امیر گروہ کے درمیان کشمکش بڑھنے لگتی ہے۔

جنگ اور سرمایہ دارانہ نظام

چنانچہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے سرمایہ دار قوتیں علاقائی جنگوں یا عالمی جنگ کا دروازہ تک کھولنے سے گریز نہیں کرتیں تاکہ اجناس اور سامان تباہ ہو جائے اور افراط جنس سے نجات ملے نیز لاکھوں اور کروڑوں افراد جنگ میں لقمہ اجل بن جائیں تاکہ بیروزگاری کے ہجوم ختم ہوں اور پھر نئے سرے سے سرمایہ جڑ پکڑنے کے قابل بن جائے جنگ زدہ عوام کی نئی آبادکاری ہو نیا سامان واجناس تیار ہونے لگیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں پھر سے جان پڑ جائے یہ چکر وقفہ وقفہ سے مسلسل چلتا رہتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام جب تک قائم ہے اس چکر سے سماج کو نجات ملنا ناممکن ہے۔

سامراجیت

سرمایہ داری جب انتہائی زوال کے درجہ پر آتی ہے تو اسے سامراجیت کا تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اور نوآبادیاتی نظام کی سرپرستی میں اسے بڑھایا جاتا ہے یہ سامراجیت بجائے خود اپنے اندر ایسے تضادات پیدا کر لیتی ہے کہ سرمایہ داریت اس کی پناہ میں آنے کے بعد اس کو بھی اس کو بھی لے ڈوبنے کی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔

سامراجیت کے تضادات اور انقلاب کا عمل

سامراجیت کے مندرجہ ذیل تضادات کسی طرح بھی حل نہیں ہو سکتے اول یہ کہ سامراجیت کی سرپرستی میں سرمایہ دار طاقتوں کو ہی بالادستی اور اقتدار کامل حاصل ہو جاتا ہے اور یہ طاقتیں ان تمام قانونی راستوں کو بند کرنا شروع کر دیتی ہیں جن کیرو سے عوام اور محنت کار طبقہ کی سیاسی تنظیم ہو سکتی ہے اور پارلیمانی ذرائع سے وہ آگے بڑھ سکتے ہیں چنانچہ ان راستوں کے بند ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محنت اور سرمایہ کا تضاد مزدور طبقہ کو انقلاب کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ اس لئے کہ غریب عوام کے سامنے یا تو ذلت اور محرومی کی زندگی بسر کرتے ہوئے سامراجیت کی چکی میں پستے چلے جانے کا راستہ رہ جاتا ہے یا پھر اس صورت حال سے بغاوت کر کے انقلاب کے لیے نکل آنا ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ مختلف سامراجی گروہ خام مال کے ذرائع اپنے قبضہ اور تصرف میں رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں جس کا نتیجہ نئے نئے مقبوضات کی تلاش اور جنگ ہے۔ اس طرح سامراجی طاقتیں خود داخلی طور پر کمزور ہوتی رہتی ہیں چنانچہ انقلاب کا عمل ان کے اس باہمی تضاد سے تیز ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ سامراجی طاقتیں جن علاقوں اور مقبوضات سے خام مال حاصل کرتی ہیں اور پھر اپنی اجناس کے لیے انہیں منڈیاں بناتی ہیں تو اس مقصد کے لیے انہیں وہاں کچھ ترقیاتی کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ راستوں کی تعمیر مواصلات کا نظام سفر کی سہولتیں، تجارتی مراکز۔ ریلیں وغیرہ وغیرہ اس سے ان مقبوضہ ممالک کے مزدور طبقہ میں بیداری آتی ہے شعور اجاگر ہوتا ہے ایک تعلیم یافتہ جماعت ابھرتی ہے اور پھر یہ ہی لوگ اپنے حقوق کی بات کرنے لگتے ہیں حتیٰ کہ آزادی کی تحریکیں جڑ پکڑ جاتی ہیں اس طرح سامراجی حکمرانوں اور محکوم و ماتحت عوام کے درمیان تضاد تیز تر ہو جاتا ہے۔ جو تحریک آزادی اور تحریک انقلاب کا سبب بن جاتا ہے اور سامراجیت و سرمایہ داری دونوں کے لیے پیغام موت ثابت ہوسکتا ہے یہاں سے انقلاب تکمیل کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

صفحات بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ داروں کا ایک محدود طبقہ معیشت کے تمام وسائل پر قابض ہو جاتا ہے اور سامراجیت کے روپ میں کروڑوں محنت کش طبقے پر حکمرانی کرتا ہے۔

سیاسی تعلق

اس طرح سرمایہ دارنہ سماج میں سرمایہ دارا اور محنت کار طبقوں کے درمیان ایک خاص قسم کے سیاسی تعلقات قائم ہوتے ہیں۔

سرمایہ دار کی سیاسی بالادستی

جس میں پہلا طبقہ یعنی سرمایہ دار دولت اور حکومت دونوں پر قابض رہتا ہے اور مزدور طبقہ دونوں

چیزوں سے محروم بنادیا جاتا ہے۔خواہ حکومت کی شکل جمہوری ہو، آمرانہ ہو، شاہیت ہو وغیرہ وغیرہ۔

لیکن محنت کش عوام کے ساتھ سرمایہ دار طبقہ کا سیاسی تعلق ہر حال میں بالا دستانہ رہتا ہے۔اس لیے کہ قانون سازی اور حکمرانی کی طاقت، سرمایہ دار طبقہ یا اس کے نمائندوں یا اس کے سرپرستوں کے ہاتھوں میں آتی ہے۔

نجات کی راہ

اس سے نجات پانے کے لیے انقلاب کے پہلے مرحلہ پر محنت کار طبقہ کو، حکمرانی اور قانون سازی کی طاقت پر قبضہ کرنا ہوگا اور سرمایہ دار طبقہ کے ساتھ وہی سیاسی تعلق قائم کرنا ہوگا جو سرمایہ دار طبقہ نے مزدور طبقہ کے ساتھ قائم کر رکھا تھا۔

محنت کاروں کی سیاسی بالا دستی

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار طبقہ کی مزدور طبقہ پر آمریت قائم تھی۔(خواہ اس کی شکل جمہوری تھی) چنانچہ اب محنت کار طبقہ کی آمریت سرمایہ دار طبقہ قائم ہونا ناگزیر ہے۔

ایک اہم فرق

لیکن یہاں ایک بڑا فرق ہوگا وہ یہ کہ پہلی صورت میں ایک اقلیت (سرمایہ دار طبقہ سماج میں ایک حقیر اقلیت ہی ہوتا ہے) کی ایک اکثریت (محنت کار طبقہ) سماج میں سب سے بڑی اکثریت ہوتا ہے) پر سیاسی بالا دستی قائم تھی۔لیکن دوسری صورت میں ایک اکثریت (محنت کار طبقہ) کی ایک اقلیت پر (سرمایہ دار طبقہ پر) سیاسی بالا دستی قائم ہوگئی۔ جو حقیقی جمہوریت سے زیادہ قریب ہے۔ یہاں تک کہ پوری سماج میں سرمایہ داریت کا امتیاز ختم ہو جائے۔معاشی اعتبار سے سوسائٹی کے تمام افراد میں مساوات قائم ہو جائے اور کوئی شخص کسی کا محتاج نہ رہے۔اسی کا نام سوشلزم ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اسلام کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا

نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس
کس نہ باشد در جہاں محتاج کس

منشورِ مُساوات،

(کمیونسٹ مینی فسٹو)

بورژوا اور پرولتاریہ

انسانی معاشرہ کی تاریخ، اپنے معلوم آغاز سے دو بڑے طبقوں میں تقسیم رہی ہے ایک طبقہ قلیل التعداد، لیکن مستبد اور مسلح طبقہ، ظالموں کا، آقاؤں کا، امیروں کا، اشرافوں کا، سرداروں کا، راجاؤں اور بادشاہوں کا، دولت مندوں کا، دوسرا طبقہ، کثیر التعداد، لیکن کمزور اور غیر مسلح طبقہ، مظلوموں کا، غلاموں کا، غیریب رعیت کا، بے حیثیتوں کا، محکوموں کا، ناداروں کا۔

پوری انسانی تاریخ ان دونوں طبقوں کی کشمکش کی تاریخ ہے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہی ہم معاشرہ (سماج) کو، مختلف پیچیدہ گیوں میں الجھا ہوا پاتے ہیں۔

مجلسی درجہ بندیوں نے، معاشرہ میں متعدد طبقات ہر جگہ پیدا کر دیے تھے قدیم روم میں، ہمیں واضح طور پر طبقہ اشرافیہ اور طبقہ غلام کے درمیان طویل کشمکش کا دور رہتا ہے۔

قرون وسطی میں جا گیردار و سردار ایک طرف اور کسان و غلام دوسری طرف صاف صاف نظر آتے ہیں اور یہ تیسرے طبقے بھی اپنے اندر بے شمار چھوٹے چھوٹے طبقات رکھتے ہوئے ملتے ہیں جن کے درمیان ہر سطح پر کشمکش پائی جاتی ہے۔

زمانہ حاضر میں بھی یہ ہی صورت حال برقرار ہے۔ البتہ موجودہ زمانہ میں معاشرہ کی طبقاتی کشمکش سمٹ کر دو مخالف جماعتوں تک محدود رہ گئی ہے جسے عہد حاضر کی اصطلاح میں، بورژوا اور پرولتاریہ[۲] کہا جاتا ہے۔

''بورژوا''

قرونِ وسطی کے غلام طبقہ سے نیم آزاد شہریوں کا ظہور ہوا اور ان شہریوں سے ہی بورژوا کے اولین عناصر کی تشکیل عمل میں آئی۔

بورژوازی کا ارتقاء

بورژوا ترقی کے امکانات کا آغاز امریکہ کی دریافت اور اس امید کے راستہ (افریقہ سے ہو کر جنوب ایشیا کی طرف آنے والا بحری راستہ) کی وجہ سے ہوا بورژوا ترقی کے امکانات میں توسیع، نوآبادیات سے تجارت، مصنوعات میں اضافہ، وسائل مبادلہ، نے دی۔

اس صورت حال نے، جہاز رانی،، صنعت اور تجارت کے بے حد وحساب ترقی دے دی، اس ترقی کی وجہ سے سے، زوال پذیر جاگیردارانہ نظام میں، انقلابی عناصر جنم لینے لگے ان عناصر نے نہایت تیزی کے ساتھ ارتقائی منازل طے کیں۔ جاگیردارانہ نظام میں اس صنعت کے ذریعہ، نئی منڈیوں کی روز افزوں ضروریات کی تکمیل نہیں ہوسکتی تھی۔

صنعتی انقلاب کا آغاز

مصنوعات میں بھی زبردست تبدیلیاں شروع ہوگئیں، قدیم زمانہ سے، پیشہ ورانہ ذرائع پیدائش کو جو اجارہ داری حاصل تھی، اب اسے متوسط طبقہ نے ایک طرف دھکیل دیا۔ چنانچہ پیشہ ورانہ اجارہ داری کی، تقسیم محنت، انفرادی کارگاہوں کی تقسیم محنت میں تبدیل ہوگئی۔ بھاپ کی دریافت او مشین کی ایجاد نے صنعتی پیداوار میں حیرت انگیز انقلاب برپا کردیا۔ کاریگر (دستکار) کی جگہ انڈسٹری آ گئی۔ صنعتی طبقہ متوسط ختم ہونے لگا۔ اس کی جگہ، لاکھوں پتی کارخانہ دار، صنعتی مزدوروں کے لیڈر اور موجودہ بورژوا نظر آنے لگے۔ عالم گیر منڈیاں قائم ہوگئیں۔ جہاز رانی اور خشکی کے ذرائع رسل ورسائل بھی بہت زیادہ ترقی کر گئے۔

چنانچہ انڈسٹری، تجارت، جہاز رانی اور ریلوے وغیرہ نے جس نسبت سے ترقی کی اسی نسبت سے

بورژوا طبقہ کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور بورژوا طبقہ نے ہر اس گروہ کو پیچھے چھوڑ دیا جو قرون وسطیٰ کی یادگار چلا آرہا تھا۔ درحقیقت موجودہ بورژوا ایک طویل اور مسلسل ارتقائی عمل کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا ہے۔

بوژوا سماج

گویا بورژوا سماج، ذرائع پیداوار اور ذرائع مبادلہ کے ایک مسلسل انقلاب کی تخلیق ہے۔ بورژوا طبقہ جیسے جیسے ارتقاء کے مراحل طے کرتا رہا، ویسے ہی ویسے اس طبقہ کے اقتدار میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

بورژوا اقتدار

جاگیردارانہ عہد میں، بورژوا طبقہ بہت مظلوم تھا۔ قرون وسطیٰ میں اس طبقہ نے مسلح اور خودمختار گروہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ جرمنی اور اٹلی میں آزاد شہری ریاستوں کا اقتدار تک اس طبقہ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ فرانس میں اس طبقہ کی حیثیت تیسری تھی۔ صنعت وحرفت کا جب دور آیا تو بورژوا طبقہ نے طبقہ اشرافیہ کی مخالفت کی اور نیم جاگیرداروں اور مطلق انسان بادشاہوں کا یہ طبقہ حامی بن گیا۔ درحقیقت بورژوا طبقہ ہی، شاہیت کا سنگ بنیاد ہوتا ہے۔ جب عالم گیر منڈیاں قائم ہوئیں، جدید انڈسٹری کا بول بالا ہونے لگا تو بورژوا طبقہ نے بھی اپنے لئے، ایک جدید نمائندہ ریاست کی بنیاد ڈالنا شروع کر دی۔ نتیجتاً اس طبقہ کو سیاسی اقتدار بھی مل گیا۔

چنانچہ عہد حاضر کی ریاست کا نظام نام ہے بورژوا طبقہ کے عمل معاملات کی دیکھ بھال کرنے والی مجلس کا۔

بورژوا انقلاب اور انسانی تعلقات میں تبدیلیاں

بورژوا طبقہ نے تاریخ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا عمل انجام دیا ہے جہاں کہیں بھی اس طبقہ کو اقتدار ملا۔ اس نے ماضی کے جاگیری، شہری اور دیہاتی تعلقات کا خاتمہ کر ڈالا۔

یہ بورژوا طبقہ ہی ہے جس نے انسان اور انسان کے درمیان خودغرضانہ تعلق اور نقد ادائیگی کے سوا کسی دوسرے تعلق کو باقی نہیں رہنے دیا۔ اس طبقہ نے روحانی مسرتوں اور دنی جوش کا خاتمہ کیا۔ شجاعت کے جذبات اور باہمی مشترک احساسات کو خودغرضی کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا۔ انسان کے ذاتی مرتبہ کو مبادلہ کی قدر میں بدل ڈالا، بے شمار آزاد اداروں کو ہٹا کر، ان کی جگہ صرف ''آزاد تجارت'' کا ادارہ باقی رکھا۔

استحصال کا نیا دور

وہ استحصال جو پہلے سیاست اور نام نہاد مذہبیت کے پس پردہ ہوا کرتا تھا اب شرمناک حد تک برہنہ اور براہ راست بربریت کے ساتھ ہونے لگا۔ بورژوا طبقہ نے ہر اس پیشہ کی تذلیل کی جسے ماضی میں انسان تکریم واحترام سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ طبیب، وکیل، مذہبی رہنما، شاعر، سائنس داں وغیرہ وغیرہ سب کو ہی اپنا اجرتی غلام بنالیا۔ افراد خاندان کے خاندانی تعلقات کو زر کے رشتہ میں بدل ڈالا۔ بورژوا طبقہ کے وجود میں آجانے سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوئی کہ قرون وسطیٰ کی بربری قوت کا اظہار، کس طرح کاہلی اور سستی پر آ کر ختم ہوا۔ بورژوا حیثیت سے یہ بات بھی آشکارا ہوئی کہ انسان کی قوت عمل کے امکانات کتنے وسیع اور حیرت انگیز ہیں۔

بورژوا طبقہ کی زندگی کی ضامن، ذرائع پیداوار کی مسلسل تبدیلیاں ہیں۔ انہیں تبدیلیوں سے، پیداواری تعلقات اور پھر سارے معاشرے کے آپس کے تعلقات بگڑتے اور بنتے رہتے ہیں۔

گذشتہ دور کے صنعتی گروہ قدیم پیداواری ذرائع میں کسی قسم کی تبدیلی کے خوگر نہیں تھے۔ ان ذرائع کو ایک ہی حالت پر قائم رکھنا پسند کرتے تھے۔ بورژوا عہد، گذشتہ ادوار سے اسی لئے ممتاز ہے کہ اس میں حالات غیر یقینی ہو گئے ہیں اور پیداوار میں مسلسل تبدیلیاں جاری ہیں۔

قدیم افکار و تعلقات کا خاتمہ

پرانے افکار اور قدیم تعلقات اپنے تمام احترام سمیت متروک قرار پا چکے ہیں نئے قائم ہونے والے تعلقات، مستحکم ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں مضبوط سے مضبوط رشتہ فنا ہوتا جارہا ہے اور

مقدس سے مقدس چیز ناپاک بن رہی ہے حتیٰ کہ، انسان مجبور ہوگیا ہے کہ بورژوا عہد میں مسائل زیست اور انسانی تعلقات کا ازسرنو نہایت سنجیدگی سے مطالعہ کرے اور ان کے مقابلہ کے قابل بنے۔

بورژوا طبقہ اپنی بڑھتی ہوئی مصنوعات کی کھپت کے لیے وسعت پذیر منڈیوں کی تلاش میں ساری دنیا پر چھا جانے کی کوششوں میں مصروف وہ دنیا کے ہر خط میں جانا چاہتا ہے۔ اور ہر خطہ پر اپنا تسلط جمانے کے درپے ہے۔ اس طرح کے ہمہ گیر استحصال سے بورژوا طبقہ نے، ہر ملک کی پیداوار اور کھپت کی اہلیت کو بین الاقوامی حیثیت دے ڈالی ہے۔

تمام قدیم صنعتی ادارے تباہ ہو چکے ہیں۔ تھوڑے بہت ایسے ادارے جو رہ گئے ہیں وہ اپنی موت آپ مرجانے والے ہیں۔

جدید انڈسٹری اور نئی ضروریات

جدید انڈسٹری، ان قدیم اداروں کی جگہ لے چکی ہے اور لے رہی ہے۔ جدید انڈسٹری کا اجرا، ترقی یافتہ قوموں کی موت وزندگی کا سوال بن گیا ہے۔ ایک ملک کی انڈسٹری کا انحصار، اس ملک کی خام پیداوار پر ہی نہیں بلکہ دور دراز ملکوں سے حاصل کی جانے والی خام پیداوار پر بھی ہوگیا ہے۔ اسی طرح انڈسٹری کی مصنوعات کی کھپت بھی صرف ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ ساری دنیا میں اس کی کھپت پھیل رہی ہے۔

قدیم ضروریات کی جگہ نئی ضروریات آئے دن جنم لے رہی ہیں۔ اور ان ضروریات کی تکمیل کے لیے۔ دور دراز ملکوں کی مصنوعات کی مانگ ہوتی رہتی ہے پرانے زمانہ کی مقامیت اور خود کفالت کا دور لد چکا ہے اور اقوام عالم کے درمیان باہمی انحصار نے بین الاقوامی تعلقات کی حیثیت حاصل کر لی ہے چنانچہ اس صورت حال کا مادی اشیا اور ذہنی افکار پر بھی گہرا اثر ہوا ہے۔ قوموں کی انفرادی ذہنی تخلیق، قوم عالم کی مشترکہ ملکیت بنی جارہی ہے۔ اور بہت سی قوموں کے ادب سے ایک عالم گیر ادب کی نشوونما کا آغاز ہو چکا ہے کسی قوم کا الگ تھلگ رہنا اور تنگ نظری میں محصور ہو جانا اب ممکن نہیں رہا ہے۔ بورژوا طبقہ دنیا کی تمام قوموں کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ بورژوا دور کے پیدا شدہ ذرائع پیداوار اپنا کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اور ان قوموں میں تہذیب کے نام سے وہ اپنے بورژوا طور طریق فروغ دینے میں کوشاں ہے۔ رسل ورسائل

کے ذرائع آسان ہوجانے سے تیز ذرائع پیداوار کی تیز رفتاری کی وجہ سے بورژوا طبقہ کو یہ زعم بھی حاصل ہوگیا ہے کہ وہ نام نہاد وحشی اقوام کو مہذب قوم بنادے۔کم قیمت مصنوعات،اس کے ہاتھ میں سب سے زیادہ کارگر اور طاقتور ہتھیار ہے،جن سے وہ کتنی ہی ''دیوار ہائے چین'' گراچکا ہے۔

دیہات پر شہروں کا تسلّط

بورژوا طبقہ نے ،دیہات پر شہروں کو مسلط کردیا ہے۔دیہات کی نسبت شہروں کو زیادہ آباد اور پُر رونق بناڈالا ہے۔بے شمار لوگوں کو دیہات کی زندگی سے محروم کرڈالا ہے۔

جس طرح دیہات پر شہروں کو مسلط کیا ہے،اسی طرح بورژوا طبقہ نے نام نہاد وحشی اور نیم مہذب قوموں پر نام نہاد مہذب اقوام کا تسلط قائم کرادیا ہے۔یعنی کاشت کار اقوام پر،بورژوا طبقہ والی قوموں کی حکومت یا صحیح الفاظ میں مشرقی اقوام پر مغربی قوموں کا تسلّط ۔

ذرائع پیداوار اور سرمایہ کا ارتکاز اور اس کا نتیجہ

اس طرح بورژوا طبقہ نے ذرائع پیداوار اور ملکیت کے حقوق لوگوں سے چھین کر اور ذرائع پیداوار کا ارتکاز کرکے،دولت وسرمایہ کو چند افراد کے قبضہ دے دیا ہے۔اس کا لازمی نتیجہ سیاسی مرکزیت میں نمودار ہوا،وہ تمام ملحقہ علاقے،جن کے مفادات علیحدہ تھے،محاصل علیحدہ تھے،قوانین علیحدہ تھے حکومتیں علیحدہ تھیں۔آہستہ آہستہ وہ سب ایک قومی مفاد،ایک مشترکہ سرحد،ایک قانونی نظام،ایک نظام محاصل اور ایک مرکزی حکومت کے ماتحت آ گئے۔

بورژوا حکمرانی کو ایک صدی سے زیادہ ہوگیا ہے۔اس مدت میں بورژوا طبقہ نے،پیداواری عناصر کو اتنا وسیع کردیا ہے کہ گذشتہ نسلوں میں اس کی مثال نہیں سکتی۔

اس دور میں،متعدد قوائے فطرت کی تسخیر ہوئی۔بھاپ سے چلنے والے جہاز بنے،صنعت میں اور زراعت میں بھی مشین کا استعمال عام ہوا۔کاشت کاری کے لیے بے شمار جنگل کاٹ ڈالے گئے،نہروں

کے جال پھیلائے گئے۔ ٹیلی گراف اور ریلوے کی سہولتیں عام کی گئیں۔

اجتماعی محنت

غرضیکہ اجتماعی محنت کے زور پر، بورژوا طبقہ نے، دنیا کو ایک نئی شکل دے ڈالی۔

گذشتہ صدیوں میں کون سوچ سکتا تھا کہ اجتماعی محنت کی گود میں پیداوار کے کتنے وسیع امکانات خوابیدہ ہیں۔ وہ ذرائع پیداوار اور ذرائع مبادلہ جن پر بورژوا عہد کی عمارت استوار ہے جاگیردارانہ عہد میں ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ اور ایک ایسے مقام پر جا پہنچے تھے جہاں مالکانہ حقوق کے جاگیردارانہ تعلقات ان ذرائع پیداوار اور مبادلہ کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔

چنانچہ ان تعلقات نے زنجیروں کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن ذرائع پیداوار اور ذرائع مبادلہ کے جدید تقاضوں کی بدولت تعلقات کی ان زنجیروں کو ایک دن ٹوٹنا تھا۔ اور انجام کار وہ دن آیا کہ یہ زنجیروں ٹوٹتی چلی گئیں۔ بورژوا طبقہ کے معاشی اور سیاسی تفوق کے پیدا ہوتے ہی اب قدیم مالکانہ حقوق کے جاگیردارانہ تعلقات کی جگہ تنظیمی اور سیاسی آئین کی حمایت کے بل پر، آزاد مسابقہ اور مقابلہ نے لے لی۔ لیکن اب یہ ہی آزاد مسابقہ اور مقابلہ کے تعلقات بورژوا سماج کے لیے وبال جان بنتے جا رہے ہیں۔

تجارتی تجران کا سلسلہ

ذرائع پیداوار کی مسلسل تبدیلیوں اور پیداوار کے پیہم اضافوں نے تجارتی بحرانوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے سارا بورژوا سماج متعدد بار مصائب کے جال میں گرفتار ہو چکا۔ اور ہر آنے والا بحران، پہلے بحران سے شدید تر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات ان بحرانوں سے نجات پانے کے لیے تیار ہونے والی اور پہلے سے تیار شدہ مصنوعات تباہ کر دی جاتی ہیں۔

بحران در بحران کی یہ کیفیت ختم نہیں ہو پاتی۔ پرانی منڈیوں کی لوٹ کھسوٹ، کے بعد نئی منڈیوں کو حاصل کرنے لیے، ذرائع پیداوار کو ضائع کرنے کے بعد، از سر نو بحال کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح ایک

اور وسیع بحران پیدا کرنے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔

اپنے خنجر سے آپ خودکشی

غرضیکہ وہ ہتھیار، جس کے ذریعہ بورژوا عہد نے جاگیردارانہ عہد کو ختم کیا تھا۔ اب بورژوا کے سر پر آن لٹکا ہے۔

بورژوا طبقہ نے اپنی تباہی کا نہ صرف یہ ہتھیار ہی تیار کرلیا ہے بلکہ اس ہتھیار کو استعمال کرنے والے ہاتھ اور باوز بھی پیدا کر دیے ہیں۔ اور یہ ہاتھ اور بازو ہیں۔ پرولتاریہ کا یہ طبقہ۔

''پرولتاریہ''

جدید محنت کار طبقہ کا نام ''پرولتاریہ'' ہے یعنی مزدوروں کا ایک ایسا گروہ، جس کی محنت سے، سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور سرمایہ میں اضافہ کرنے والی محنت کی ہی ان مزدوروں کو مزدوری ملتی ہے۔

پرولتاریہ کی محنت

اس گروہ کی زندگی کا دار مدار اس قسم کی مزدوری پر ہی ہے۔ یہ مزدور یعنی پرولتاریہ، اپنی محنت فروخت کرتے ہیں۔ اور ان کی حیثیت، تجارتی چیزوں جیسی ہے۔ پرولتاری محنت کار کی محنت کی انفرادی ہیئت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محنت کار کام میں کوئی مسرت نہیں پاتا۔ اس کی حیثیت بھی مشین کے ایک پرزہ کی سی ہے۔ جدید محنت کار یعنی پرولتاریہ کا یہ حشر مشین کے بڑھتے ہوئے استعمال اور محنت کی جدید تقسیم کے نتیجہ میں ہوا ہے۔

بورژوا طبقہ کا غلام

بورژوا طبقہ، زورکار، سادہ لوح اور کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے والا مزدور چاہتا ہے۔ مزدور کو صرف اتنی اجرت دی جاتی ہے جس سے وہ بنیادی ضروریات زندگی بہ مشکل پوری کر سکے۔ اور اپنی اولاد کو، بورژوا طبقہ کی غلامی کے لیے پرورش کرتا ہے۔

عہد حاضر کی انڈسٹری نے، پرانے دور کے چھوٹے کارخانہ دار کو، صنعتی سرمایہ دار بنا ڈالا ہے۔ اور فیکٹریوں کا کام کرنے والی مزدور جماعتوں کی تنظیم فوجی سپاہیوں کی طرح کی جاتی ہے۔ اس طرح مزدور گروہ اولاً مشین کا غلام اور بالواسطہ بورژوا کارخانہ کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ یہ دوہری غلامی جس جبر و استبداد کا نتیجہ ہے وہ بالکل واضح ہے اور قابل نفرت اور برداشت کے ناقابل ہے۔ موجودہ انڈسٹری کی ترقی نے جسمانی محنت کو کم کر دیا ہے اور محنت کار طبقہ کے لیے اب جنس اور عمر کا امتیاز باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ سب کو آلات محنت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

پرولتاریہ میں شامل حلقے

پرولتاریہ کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے تاجر، دوکان دار کسان، دست کار، اسکول ٹیچر، عام لکھنے کا کام کرنے والے سب ہی شامل ہیں۔ اس لئے کہ ان کے پاس اتنی پونجی ہی نہیں ہوتی کہ وہ صنعتی مسابقہ میں اپنے بل پر زندہ رہ سکیں۔ اور کسی بھی فن میں ان کی خصوصی مہارت جدید ذرائع پیداوار کے مقابلہ میں بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔

چنانچہ آبادی کے بیشتر طبقات ''پرولتاریہ'' میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

پرولتاریہ کے تشکیلی وارتقائی مراحل

پرولتاریہ کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ گویا یہ اس کی ارتقائی منازل میں پرولتاریہ کو پیدائش سے ہی، پرولتاریہ کو مدّ مقابل بن جانا پڑتا ہے۔ یہ تصادم ابتدا میں، انفرادی مزدوروں سے شروع ہوتا ہے۔ پھر فیکٹری کے مزدوروں کا بورژوا کے ساتھ تصادم کا مرحلہ چل پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ تجارت کے میدان میں

انفرادی بورژوا سے، یہ تصادم برپا رہتا ہے۔ جہاں بورژوا پرولتاریہ کو براہ راست لوٹتا ہے۔

دراصل مزدور، غیر منظّم طور پر ساری دنیا پھیلے ہوئے ہیں۔ باہمی مسابقہ کی وجہ سے وہ متحد نہیں ہو پاتے۔

پرولتاریہ کا اتحاد وانتشار

اگر کہیں وہ منظّم جماعتوں کی شکل میں نظر آتے ہیں، تو ایسا ان کی اتحادی سرگرمیوں کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ بورژوا، اپنے سیاسی مفاد کے لیے ایسے حالات پیدا کرکے، پرولتاریہ کو حرکت میں لاتا رہتا ہے۔ان حالات میں پرولتاریہ اپنے دشمنوں سے نہیں لڑتا۔ بلکہ اپنے دشمنوں کے دشمنوں سے لڑ پڑتا ہے یعنی شاہیت کے باقیات سے، جاگیرداروں سے، غیر صنعتی بورژوار سے اور چھوٹے بورژوا سے۔

یہ ہر حال انڈسٹری کے ترقی سے پرولتاریہ کی تعداد مین اضافہ ہوتا رہتا ہے وہ بڑی تعداد میں منظّم بھی ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی قوت بڑھتی رہتی ہے۔مشین محنت کے امتیاز کو باقی نہیں رہنے دیتی۔ ہر جگہ مزدوروں کی اجرت یکساں ہو جاتی ہے۔اس طرح زندگی کے مختلف مدارج میں یکسانیت آجاتی ہے۔

طبقاتی تصادم

کارخانہ داروں کی باہمی مسابقت اور تجارتی بحران سے، مزدوروں کی اجرت میں اضافہ ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مشین کے بڑھنے سے حصول روزگار مشکل تر بن جاتا ہے۔اور انفرادی بورژوا کے ساتھ تصادم اس مرحلہ پر دوطبقوں کا تصادم بن کر ابھرتا ہے۔اب مزدور کے خلاف تنظیمیں بنانے لگتے ہیں۔اجتماعات شروع ہوجاتے ہیں۔ جو فسادات اور توڑ پھوڑ کی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

پرولتاریہ کی تنظیم کا وسیع عمل

اگرچہ کبھی کبھی ہنگامی طور پر مزدوروں کو کچھ کامیابی بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن دیرپا نہیں ہوتی۔ دراصل اس مرحلہ کی کشمکش کا مقصد فوری نتائج کا حامل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس مرحلہ سے وسیع پیمانہ پر مزدوروں کی تنظیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ایک کارخانہ سے متعدد کارخانوں تک اور ایک شہر سے متعدد شہروں تک اور ایک ملک سے متعدد ملکوں تک پھیل جاتا ہے۔ جدید رسل و رسائل کے ذریعہ، زیادہ سے زیادہ وسیع تنظیم کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جو زمانہ سابق میں ممکن نہیں تھا۔

سیاسی مرحلہ

پرولتاریہ کی اس مرحلہ کی طبقاتی تنظیم، سیاسی مرحلہ مین داخل ہو جاتی ہے تاہم مزدوروں کے باہمی مسابقہ سے، یہ تنظیم بھی بار بار درہم برہم ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر بار پہلے سے زیادہ طاقتور تنظیم کے مواقع مل جاتے ہیں۔ اور بورژوا کی نااتفاقی اس مرحلہ پر پرولتاریہ کی تنظیموں کو آئینی حیثیت میں لانے کا بھی موجب بن جاتی ہے۔

کشمکش و تصادم

بورژوا ہمیشہ ایک مسلسل جنگ کی صورت میں رہتا ہے۔ معاشرہ کی طبقاتی کشمکش پرولتاریہ کے مفاد کا راستہ بناتی رہتی ہے۔

بورژوا، اولاً، اشرافیہ سے جنگ میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کے بعد بورژوا طبقہ کے ان افراد سے اس کی ٹھنی رہتی ہے۔ جنہیں انڈسٹری کی ترقی سے نقصان پہنچا ہے۔ ایک ملک کا بورژوا، دوسرے ملک کے بورژوا سے بھی مسلسل متصادم رہتا ہے۔

یہ حالات بورژوا کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے مدمقابل بورژوا پر فتح حاصل کرنے کے لیے پرولتاریہ کی سیاسی مدد حاصل کرے۔ اس طرح خود بورژوا ہی پرولتاریہ کو سیاسی میدان میں لے آتا ہے۔ دوسری طرف انڈسٹری کے فروغ سے، تمام حکمران طبقات کا سامان زیست خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اور یہ

حکمراں طبقے بھی بالآخر پرولتاریہ میں خود کو مدغم کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز پرولتاریہ کی ترقی میں زبردست معاون بن جاتی ہے۔

فیصلہ کن ساعت میں بورژوا کا کردار

چنانچہ طبقاتی جنگ جب فیصلہ کن ساعت کے قریب آتی ہے تو اس وقت حکمراں طبقہ کے اقتدار کے خاتمہ کا وقت آ پہنچتا ہے اور حکمراں جماعت کا ایک حصہ وقت کے تقاضہ کو بھانپ کر اس انقلابی جماعت کا شریک کار ہو جاتا ہے۔ جس کے ہاتھوں میں مستقبل کی عنان حکومت جاتی نظر آتی ہے۔ جس طرح ابتدائی دور میں، اشرافیہ کا ایک حصہ بورژوا میں شامل ہو گیا تھا، اسی طرح اب بورژوا کا ایک سمجھ دار حصہ پرولتاریہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

صرف پرولتاریہ ہی انقلابی جماعت ہے

لیکن بورژوا کے مقابلہ پر آنے والی تمام جماعتوں میں پرولتاریہ ہی انقلابی جماعت ہوتی ہے۔

نچلا درمیانی طبقہ، یعنی چھوتے صنعت کار، دوکان دار، چھوٹے زمیندار اور کسان وغیرہ بورژوا سے اس لیے، جنگ آزما ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو متوسط طبقہ کی حیثیت سے زندہ رکھ سکیں یہ طبقہ ہرگز انقلابی نہیں ہوتا بلکہ قدامت پسند اور رجعت پسند ہوتا ہے۔ انقلاب پسند تو وہ صرف اس لیے بن جاتے ہیں کہ کہیں مکمل پرولتاریہ میں وہ تبدیل نہ ہو جائیں۔

صرف اپنے آئندہ مفاد کے لیے وہ اپنا زاویہ نگاہ ترک کر کے پرولتاری زاویہ نگاہ اختیار کر لیتے ہیں۔ پرولتاریہ کے سوا، جن جماعتوں کو برتری حاصل رہی ہے، انہوں نے اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے، معاشرہ کو غلام بنا کر جدوجہد کی ہے۔

حصول ملکیت کے ساتھ سابقہ حالات کا خاتمہ ضروری ہے

پرولتاریہ معاشرہ کے پیداواری عناصر پر اس وقت تک قابض نہیں ہوسکتا جب تک حصول ملکیت کے سابقہ حالات وہ ختم نہیں کر ڈالتا۔ جدید صنعتی محنت نے اور سرمایہ کی غلامی نے، یورپ میں پرولتاریہ سے اس کا ملی کیرکٹر چھین لیا ہے اسی لئے یورپ کا پرولتاریہ، قانون اخلاق، مذہب سب کو بورژوا توہمات سے تعبیر کرتا ہے۔ ماضی کی تمام تحریکیں، اقلیتوں کی تحریکیں تھیں یا اقلیتوں کے مفاد کے تحریکیں تھیں۔

اکثریت کے مفاد کی واحد تحریک

پرولتاریہ تحریک ہی وہ واحد اکثریتی تحریک ہے جو خود شناسی اور آزادی کے جذبہ پر مبنی ہے اور اکثریت کے مفاد پر مشتمل ہے۔ چنانچہ پرولتاریہ کی تحریک کی سربلندی دقیانوسی سماج کے خاتمہ پر منحصر ہے۔ اور اس کے لیے، انفرادی ملکیت کے تسلط سے نجات حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

خانہ جنگی اور انقلاب

پرولتاریہ کے مذکورہ بالا تدریجی ارتقائی مراحل ہیں۔ اس خانہ جنگی کا سراغ مل جاتا ہے جس سے موجودہ سماج گزر رہی ہے اور جو اس مقام تک آ گئی ہے جہاں جنگ انقلاب کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں بورژوا تسلط کا خاتمہ کرنے اور پرولتاری اقتدار برتری قائم کرنے کے امکانات ملتے ہیں۔

موجودہ معاشرہ

موجودہ معاشرہ کی شکل، ظالم و مظلوم گروہوں کے عناد و کشمکش کی پیداوار ہے۔ لیکن ماضی میں ظالم استحصالی طبقہ اپنے استحصال و استبداد کو جاری رکھنے کے لیے مظلوموں کو بقدر زیست سامان زیست مہیا کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غلامی کے دور میں غلاموں نے بتدریج پنچایتی رکن کی حیثیت حاصل کر لی اور جاگیردارنہ عہد میں چھوٹے کاروبانے بورژوا کی صورت اختیار کر لی۔

عہد حاضر کا مزدور

لیکن عہد حاضر کا مزدور، انڈسٹری کی ترقی کے ساتھ پستیوں میں اترتا چلا جارہا ہے۔ اس کی حیثیت اب ایک گداگر کی سی بن کر رہ گئی ہے۔ آبادی اور دولت میں جوں جوں اضافہ ہوتا جاتا ہے، مزدور کی گدا گرانہ حیثیت اور پستی اتنی ہی زیادہ ہو رہی ہے۔

بورژوا طبقہ کی نااہلی

اس کا مطلب یہ ہوا کہ، بورژوا، ایک حکمراں جماعت کی حیثیت میں نہایت نالائق نکلا۔ وہ اپنے غلاموں کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ انہیں روٹی مہیا کرنے کے بجائے خود اپنے غلاموں سے روٹی چھین لیتا ہے۔

اس حالت میں بورژوا گروہ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک طاقت، نظام اور قانون کی صورت میں وسائل حیات معاشرہ میں تقسیم کرنے کی ذمہ داری لے۔

بورژوا سماج کا خاتمہ ضروری اور یقینی ہے

پس موجودہ معاشرہ کے لیے، بورژوا کا وجود ناقابل برداشت ہے۔ اور سماج کو اب اس گروہ کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ بورژوا اپنا وجود اور اپنی برتری سرمایہ کے بل پر قائم کرتا ہے سرمایہ ''اجرتی محنت کے ذریعہ فراہم ہوتا ہے اور اجرتی محنت، مزدوروں کے باہمی مسابقہ پر انحصار رکھتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انڈسٹری کی ترقی مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ بے کار بناتی چلی جارہی ہے۔ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں بورژوا اپنی قبر اپنے ہاتھ سے کھود رہا ہے اور اس کا ہی پیدا کردہ پرولتاریہ اس کے لیے، گورکنی کے فرائض انجام دینے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

''پرولتاری اور اشترا کی کا تعلق''

اشترا کی جماعت، محنت کار طبقہ کی جماعت کے منافی نہیں ہوا کرتی۔

پرولتاریہ کا مجموعی مفاد، اشترا کی پارٹی کا بھی مفاد ہوتا ہے۔

پرولتاری تحریک کو منظّم کرنے میں، اشترا کی فرقہ داریت کو ہرگز شامل نہیں کرتا۔

اشترا کی پارٹی کے سامنے دو اہم اور بنیادی مقصد ہوتے ہیں۔

۱۔ مختلف علاقوں کے پرولتاریہ کی جداگانہ جدوجہد کو متاسیت وانفرادیت سے جدا کر کے ہمہ گیر اجتماعی تحریک میں بدلنا۔ حتیٰ کہ قومی سطح کی جدوجہد کو بین الاقوامی سطح تک لے جانا۔

۲۔ محنت کار طبقہ اور بورژوا طبقہ کی جدوجہد کے مختلف ادوار کا اس طرح تجزیہ کرنا اور انہیں سامنے لانا جو بحیثیت مجموعی پرولتاری تحریک کے مفاد میں ہے

اشترا کیت کا نصب العین ہے۔

''پرولتاریہ کو ایک منظّم طبقہ کی شکل دینا، بورژوا کے غلبہ وتسلط کا خاتمہ کرنا اور پرولتاریہ کو، سیاسی اقتدار پر فائز کرنا''۔

اشترا کی کی حیثیت مصلح کی نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ طبقاتی کشمکش کو تیز کرتا رہے اور جو تاریخی حرکت جاری ہے اسے پیش کرتا رہے۔

موجودہ ملکی تعلقات ختم کرنا اشترا کی کا کام نہیں ہے۔ ملکی تعلقات تاریخی حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں۔

ملکیت کا خاتمہ بھی، اشترا کی کی امتیازی خصوصیت نہیں۔ البتہ وہ بورژوا ملکیت کو ختم کرنے کا مدعی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بورژوا ملکیت کا مطلب چند افراد کا اکثریت کو لوٹتے رہنا ہے۔

ذاتی ملکیت تو انڈسٹری کی ترقی سے خود بخود ختم ہوتی جارہی ہے۔

اور اجرتی محنت سے ملکیت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اجرتی محنت تو صرف سرمایہ پیدا کرتی ہے۔ سرمایہ ایک ایسی ملکیت ہے۔ جو اجرتی محنت کو لوٹتی ہے۔ اور یہ ملکیت اس وقت تک بڑھ ہی نہیں سکتی جب تک اسے مزید لوٹ کھسوٹ کے لیے اجرتی محنت حاصل نہ ہو۔

موجودہ صورت میں، ملکیت کی بنیاد، اجرتی محنت اور سرمایہ کی کشمکش ہے۔ غور کیجیے تو سرمایہ معاشرہ

کے سارے ارکان کی مشترکہ محنت سے حاصل ہوتا ہے اور اجتماعی طور پر تخلیق ہوتا ہے۔ اس لئے سرمایہ کو انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی قوت کہا جائے گا۔

اس کے مقابلہ میں اجرتی محنت کیا ہے؟ اجرتی محنت کی اوسط قیمت کم سے کم اجرت ہے (اس لئے کہ اجرت کا اصول ہی کم سے کم پر رکھا گیا ہے) یعنی مزدور کو بہ مشکل زندہ رہنے کے ذرائع میسر آسکیں۔ اسے ملکیت نہیں کہا جا سکتا۔ اشتراکیت محنت کے اس حاصل کو ختم کرنا نہیں چاہتی۔

اشتراکیت اجرتی محنت کے حصول کے اس کربناک ذریعہ کو ختم کر دینا چاہتی ہے جس کا اصل مقصد محض سرمایہ میں اضافہ کرنا اور سماج کے بالا دست طبقہ کے مفاد میں محنت کار کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔

یعنی، بورژوا سماج میں مزدوری کا مقصد ہوتا ہے اجتماعی مزدوری کو زیادہ سے زیادہ بڑھا کر، سرمایہ حاصل کیا جائے۔ لیکن اشتراکی سماج میں، اجتماعی مزدوری کا مقصد، مزدور کے لیے ذرائع حیات کو زیادہ سے زیادہ وسیع و عام کرنا ہے۔

بورژوا سماج میں، حال پر ماضی غالب رہتا ہے۔ جب کہ اشتراکی سماج میں ماضی پر حال غالب ہوتا ہے۔

بورژوا سماج میں اگرچہ سرمایہ کو آزاد اور منفرد حیثیت میں رکھا جاتا ہے لیکن اس طرح زندہ انسان انحصار اور محکومیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اشتراکیت اس صورت حال کو ختم کرتی ہے تو بورژوا طبقہ چیختا ہے۔ کہ انفرادیت اور حریت کے حق کو ختم کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اشتراکیت صرف بورژوا انفرادیت، بورژوا حریت کا خاتمہ کر کے، پرولتاریہ کی انفرادیت و حریت قائم کرتا ہے۔

انفرادی ملکیت کی تنسیخ کے اعلان سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ موجودہ معاشرہ میں 95 فی صد لوگ ذاتی ملکیت سے محروم رکھے جاتے ہیں اور 5 فیصد انسان 95 فی صد لوگوں کی محنت پر عیش کرتے ہیں۔

اس صورت حال کے بدل جانے پر ہر شخص اپنی محنت کے حاصل کا مالک ہوگا۔ اشتراکیت کا اصل مدعا یہی ہے۔

معاشرہ اور شخصیت

آج کے دور میں فرد کے مسئلے نے انتہائی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہر ایک کا واسطہ ہے۔ دنیا کی تاریخ اب ایک ایسے مرحلہ پر آ پہنچی ہے جب ہر صاحب فکر انسان کو اپنے ذاتی مقدار اور زمانے کے ان بنیادی معاشرتی مسائل کے حل کے درمیان تعلق کا شدید احساس ہو گیا ہے جن مسائل پر انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت، پرولتاریہ اور بورژوازی، ترقی اور پسند اور رجعت پرست قوتوں کے درمیان آج جو جدو جہد جاری ہے۔ اس نے انسانی مسائل کی اہمیت بڑھا دی ہے۔

فرد اور معاشرہ کے درمیان تعلق کا مطالعہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ چند نظریاتی اور منہاجی مسائل کو مرتب اور حل نہ کر لیا جائے جدید عمرانیاتی سائنس ان مسائل کو جس طرح ترتیب دیتی اور تجزیے کا موضوع بناتی ہے اس کے تعلق سے پیدا ہونے والے نظریاتی مسائل میں سے اہم ترین یہ ہیں۔

۱۔ معاشرہ فرد کی نشو ونما، اس کی سرگرمی، اس کی صلاحیتوں کے اظہار اور استعمال کے کیسے معاشرتی حالات، روحانی اور مادی مواقع فراہم کرتا ہے؟

۲۔ معاشرتی حالات سے انسان کس طرح کا ربط رکھتا ہے؟

۳۔ انسان کی انفرادیت، معاشرے میں، کس طرح تشکیل پاتی ہے؟

۴۔ ایک معین معاشرتی نظام کے اندر،

معاشرہ اور فرد کے مفادات کو کس طرح ہم آہنگ کیا جاتا ہے؟

ان کے تعلق کو، جب وہ مختلف معاشرتی نظاموں کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں۔ معین کرنے والے اصول کیا ہیں؟

۵۔ وہ تاریخی عمل کیا ہے جس میں فرد تشکیل پاتا اور ترقی کرتا ہے؟

۶۔ تاریخ میں فرد کا رول کیا ہے؟

شخصیت کی انفرادی نشو ونما

سائنس، فلسفے اور روزمرہ کی زندگی میں آدمی کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے کئی اصطلاحات مستعمل ہیں، جیسے

آدمی، فرد، شخصیت انفرادیت وغیرہ۔

آدمی

ایک انتہائی عام تصور ہے۔ جو ایک حیاتیاتی قسم، یعنی نوع انسان کی خصوصیات بیان کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذی روح ہستیوں کی اس نوع کی فطرت، معاشرتی ہوتی ہے اور ہر ہستی کو جس کا تعلق اس نوع سے ہے، انسان کے نام سے پکارے جانے کا حق ہے۔

فرد

واحد انسانی ہستی کو کہتے ہیں ہر آدمی بلالحاظ جنس، عمر یا تاریخی عہد کے فرد ہے۔ فرد انسانی نسل کی اکائی ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ انفرادی خصوصیات کی حیثیت سے آدمی جتنا کم ترقی یافتہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی شخصیت نہیں فرد زیادہ ہوتا ہے۔

شخصیت

یہ بھی واحد انسانی ہستی ہے۔ لیکن ہر آدمی شخصیت نہیں ہوتا۔ نوزائیدہ بچہ، آدمی تو ہے، لیکن شخصیت نہیں ہے۔

فرد، ''شخصیت'' اس حد تک بنتا ہے جس حد تک وہ ثقافت کی فضیلتوں کو جذب کرتا ہے۔ سرگرمی کا باشعور خالق ہو جاتا ہے۔ اور اپنے افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

شخصیت کی تشکیل آدمی کے انفرادی اور معاشرتی ارتقا کے عمل کے دوران ہوتی ہے۔

لیکن یہ انفرادی ارتقا یعنی ایک مخصوص انفرادیت کی تشکیل بیک وقت ایک ایسا عمل ہوتا ہے جس

میں آدمی، اپنا نوع انسانی کا جوہر حاصل کرتا ہے۔

نوع انسانی کا جوہر محض نسل انسانی کی رکنیت نہیں ہے بلکہ بقول مارکس آدمی اپنے جوہر کے لحاظ سے تمام معاشرتی تعلقات کی میزان کل ہے۔ دراصل جب ہم کسی ایک یا دوسرے معاشرے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ہر معین معاشرہ میں، اس کی امتیازی خصوصیات اور آدمی کے ٹھوس جوہر کا پتہ چلتا ہے۔

آدمی اور معاشرہ کو ایک بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ آدمی معاشرے میں تحلیل نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایسی چیز کی طرح قائم رہتا ہے جو معاشرہ سے ممتاز ہوتی ہے، کیوں کہ ہر ایک آدمی بے مثل انفرادیت اور معین شخصیت ہوتا ہے۔ ہر آدمی کا تعلق، معین دور، ٹھوس معاشرے، قوم اور طبقے سے ہوتا ہے، اور ہر آدمی بے مثال سیرتی خصوصیات کا بھی مالک ہوتا ہے جو صرف اس کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا شخصیت کی تشکیل ایک ایسا عمل ہے جو مذکورہ بالا تین پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔

ہر آدمی کی زندگی ایک معین حیاتیاتی دور سے ہو کر گذرتی ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے۔ بالغ بنتا ہے۔ بڑھاپے کی منزل میں پہنچتا ہے اور مر جاتا ہے۔

حاصل عمرم سہ حرف است وبس

خام بدم، پختہ شدم سوختم

حیاتیاتی ارتقا کے سبب ہی بچوں کو ایک عرصہ تک والدین کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ انسانوں کی حیاتیاتی ضرورت ہوتی ہیں۔

غذا، پانی، نیند، آرم۔ جنسی خواہش وغیرہ۔

ہر آدمی کی خصوصیت کا تعلق اس کی فطری استعداد اور مخصوص مزاج سے ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں آدمی ایک دوسرے سے جنس عمر، نسل کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان سب کی بنیاد حیاتیاتی ہے۔

چنانچہ انسان دراصل فطرت کی اولاد ہے۔ اس کے معاشرتی ارتقا کی سطح خواہ کچھ بھی ہو، فطرت سے اس کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے۔

آدمی کے معاشرتی ارتقا کی بنیاد اور لازمی شرائط ہمیشہ حیاتیاتی رہی ہیں۔ جو معاشرتی حالات کے

زیر اثر بدل جاتی ہیں۔ اوران کے معین معاشرتی نتائج بھی نکلتے ہیں۔

مثلاً نجی ملکیت کے نظام کے تحت، عورت پر مرد کی معاشرتی معاشی برتری کے ذریعہ جنسوں میں فرق وامتیاز۔ جغرافیائی ماحول کے تحت، رنگ ونسل کا فرق جس کے نتائج سماجی اور معاشی تضاد رکھنے والے معاشرے میں۔ نسلی امتیازات عدم مساوات، اورنسل پرستانہ نظریوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ نسلوں کے درمیان کشمکش عالمی تاریخ کا محور بن جاتی ہے۔ حالانکہ جہاں تک آدمی کی فطرت اوراس کے سوچنے اورعمل کرنے کی صلاحیت کا تعلق ہے، نسلی امتیازات بالکل بے معنی ہیں۔ عمر کا فرق بھی معاشرتی اہمیت رکھتا ہے سرمایہ دارانہ نظام میں، نوجوانوں کے مسائل اسی لیے سر اٹھاتے ہیں اورنسلوں کے درمیان خلیج (GENERATION GAP) پیدا کر دیتے ہیں۔

غرضیکہ فرد، اورمعین معاشرتی، قول وماحول کے درمیان ایک رشتہ ہوتا ہے اور یہ رشتہ کسی حد تک فرد کے انفرادی ارتقا کی نوعیت اوراس کے مستقبل کے رخ کو پہلے سے مقرر کر دیتا ہے۔

اس طرح معاشرتی ماحول، آدمی کو ایک شخصیت میں تبدیل کرتا ہے یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے کہ آدمی کی زندگی کا تقریباً ایک تہائی حصہ دوسرے انسانوں کی براہ راست دست نگری میں گزرتا ہے۔ اور باقی حصہ کے لیے وہ ضروریات زندگی دوسرے لوگوں سے ''سرگرمی'' کا تبادلہ کر کے حاصل کرتا ہے انسان اپنی تمام حیاتیاتی حاجتیں، بشمول ان حاجات کے جو معاشرتی ارتقا کے دوران پیدا ہوتی ہیں پوری کرنے کے لیے ذرائع اور طریقے سب کے سب معاشرہ سے حاصل کرتا ہے۔ اور پھر کا روحانی انحصار بھی دوسرے لوگوں پر ہی ہوتا ہے۔ زبان علم، فرائض اورحقوق کے تصورات، رویے اور برتاؤ کے معیار اورقاعدے وہ دوسرے لوگوں سے ہی حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ آدمی صرف اپنے وجود کے قیام کے لیے ہی معاشرے سے ذرائع حاصل نہیں کرتا۔ بلکہ اپنا عمل کرنے کا ڈھنگ بھی معاشرے سے ہی سیکھتا ہے۔ اس لیے شخصیت کی تعلیم ونشوونما زندگی کے ایک خاص دور تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ، آدمی قبر تک سیکھتا رہتا ہے۔ البتہ اس عمل میں، کیفیت کی منزلیں، ایک دوسرے سے ممیز کی جاسکتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بچپن درنوجوانی میں، بیرونی تحریکات اوراثرات کے ردعمل اور تبدیلی کی مزاحمت کی جو ساخت تشکیل پا جاتی ہے وہ کم وبیش آخر وقت تک قائم رہتی ہے اور یہ خالص نفسیاتی ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انفرادی اورمعاشرتی ارتقا کے دوران انسان کی

تبدیلی اور حالات کی مطابقت پذیری ایک ایسا عمل ہے جو تقریباً زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

یہاں اس کی دو بنیادی منزلیں ہیں۔

ایک بچپن سے نوجوانی تک، مطابقت پذیری، کی منزل۔

دوم، بالغ فرد کی، اہم سرگرمی کی منزل، جسے معاشرے میں انسان کی ''آزاد'' سرگرمی کی منزل کہا جاتا ہے۔

دراصل آدمی 'بالغ'، ہی اس وقت ہوتا ہے، جب وہ معاشرے میں ایک معین معاشرتی رول ادا کرنے لگتا ہے اور یہ اس کے جائزہ ذات، اور دوسروں کے جائزے میں تبدیلی کی اصل بنیاد ہے۔

فرد ہمیشہ معین ماحول، خاندان، اسکول، پیداواری گروپ وغیرہ جیسے اجتماع میں تشکیل پاتا، ان میں رہتا اور ان کے درمیان عمل کرتا ہے۔ اس کی انفرادی ہستی کا دار و مدار، براہ راست اس کے قریبی ماحول، یعنی ''چھوٹے گروپوں'' کی امتیازی خصوصات پر ہوتا ہے۔ جو دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کے براہ راست برابطوں کا حلقہ ہیں۔

شخصیت، اس کی انفرادی ہستی کے قریبی مادی حالات، چھوٹے گروہوں قدروں، روایات اور قاعدوں کے نظاموں سے تشکیل پاتی ہے اور ایک ہی چھوٹے ماحول میں مختلف انفرادیتیں تشکیل پاتی رہتی ہیں۔ انسان اپنے ماحول کا اثر مجہول طریقے پر قبول نہیں کرتا بلکہ ماحول کی جانب اس کا رویہ سرگرم ہوتا ہے۔

چھوٹے اور بڑے دونوں ماحولوں کا اثر منتخب کرنے کی نوعیت کا انحصار کئی اسباب پر ہوتا ہے۔ ان میں ایک سبب یہ ہے کہ ہر آدمی کی قدرتی قابلیت اور سرگرمی کافی رول ادا کرتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی آدمی اور اس کا قریبی ماحول معاشرتی تعلقات کے وسیع تر طبقاتی بین الطبقاتی، قومی اور بین الاقوامی وغیرہ نظاموں سے متصل ہو جاتے ہیں۔

انفرادیت صرف ایک چھوٹے ماحول کی ہی پیداوار نہیں ہوتی۔ درحقیقت مختلف اثرات کے پیچیدہ نظام کے اندر، جس سے انفرادیت تشکیل پاتی ہے فیصلہ کن اہمیت مخصوص معاشرے کی زندگی میں ان عام حالات کو ہوتی ہے جو فرد پر براہ راست اور چھوٹے ماحول کی مخصوص گزرگاہوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

فرد جب معاشرتی پختگی کی ایک معین منزل پر پہنچ جاتا ہے تو ان مسائل کی جانب سرگرم رویہ اختیار کرنے

لگ جاتا ہے۔جنہیں طبقاتی،قول اور بین الاقوامی مفادات پیدا کرتے ہیں۔یعنی وہ مسائل جو چھوٹے گروہوں کے مفاد کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں۔شخصیت کی تشکیل کے ابتدائی مدراج میں آدمی کی سرگرمی کھیل کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بچہ کھیل کے ذریعہ ہی سب سے پہلے دنیا اور اشیا کی صفات کا علم حاصل کرتا ہے اپنی انفرادیت کو ڈھالتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے۔ بعد میں تعلیم،کام اور مختلف قسم کی مادی اور روحانی سرگرمی اس عمل میں شمل ہو جاتی ہے۔جس کے ذریعہ انسان دنیا کے ساتھ باہمی تبادلہ عمل کرتا ہے۔انسان کا جوہر سرگرم رہتا ہے۔وہ ماحول کی مجہول پیداوار نہیں ہے۔اور ماحول سے اضافی طور پر آزاد ہے۔یہ اضافی آزادی شخصیت کے رویے کے ڈھانچے کی تشکیل کے لیے لازمی شرط ہے۔آدمی جب اپنے فیصلہ کی بنا پر کوئی عمل کرتا ہے۔تو وہ ایسی ہستی نہیں رہتا،جس کا رویہ اس کے ماحول نے پہلے سے معین کر دیا ہوا اور جو بالکل ماحول کا پابند ہو۔بلکہ اب وہ اپنے عمل کے خالق کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ آدمی جس حد تک اپنے رویے میں آزاد ہوتا ہے اسی حد تک یہ چیز اس کی شخصیت کے ارتقا کی نشانی بن جاتی ہے۔

شخصیت کا تاریخی ارتقا

انسانی محنت کے عمل کے دوران اور محنت ہی کی بنیاد پر فطرت کی گود سے ابھرا ہے۔لیکن قدیم معاشرے میں (ابتدائی گلے،خاندان،قبیلے) وہ اپنی برادری سے اتنا زیادہ پیوستہ تھا کہ وہ اپنے آپ سے ایک آزاد شخصیت کی طرح واقف نہیں تھا۔وہ اپنی ذاتی ہستی سے ایک معین برادری کے رکن کی طرح آگاہ تھا۔

''فرد قائم ربط ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں''

انسانی اجتماع کی یہ ابتدائی وحدت نتیجہ تھی پیدا آور قوتوں کی غیر ترقی یافتہ حالت اور فطرت پر انسانوں کے زیادہ سے زیادہ انحصار کا۔جس سے وہ انفرادی طور پر پیدا کرنے والوں کی طرح نہیں بلکہ ایک معین اجتماع کی طرح دوچار تھے۔تاریخی اعتبار سے انسان نے،شخصیت کا روپ،اس وقت دھارنا شروع کیا جب قدیم پنچائتی اجتماع منتشر ہو گیا اور طبقاتی معاشرہ ابھر آیا۔اور جب انسانوں کی سرگرمی کے

نتیجوں کا روز افزوں انحصار، ان کی انفرادیت اور انفرادی فیصلوں پر ہونے لگا۔

ان حالات میں فرد کا شخصیت کرنا ضروری ہو گیا جسے بیرونی ماحول نے جنم دیا اور جس کا سرچشمہ معاشرتی ارتقا کی خارجی ضرورت تھیں۔ معاشرے اور شخصیت کے درمیان تعلق کے مسئلہ کی جانب، ہر معاشرتی تشکیل کا اپنا جدا نقطہ نظر اور اپنا جدا حل ہوتا ہے۔ اور اس پر مختلف ملکوں میں اپنی اپنی جداگانہ امتیازی خصوصیات اور روایات کی چھاپ ہوتی ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں تین نکات پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ خارجی حالات جن پر ایک معاشرہ میں شخصیت نشو ونما پاتی ہے۔

۲۔ وہ سطح جس تک شخصیت کی اپنی سرگرمی اور خود آگاہی ترقی کر چکی ہوتی ہے۔

۳۔ وہ حد جس تک معاشرہ آدمی کو ایک شخصیت تسلیم کرتا ہے۔

انفرادی ملکیت کے نظام اور طبقات میں تقسیم معاشرہ کی بنیاد پر تشکیل یافتہ شخصیت، طبقاتی شخصیت ہوتی ہے۔ اور معاشرے سے اس کا تعلق، طبقے، حکمراں، جماعت بندی یا فرقے کے نمائندہ کی حیثیت میں بالواسط باہمی رشتہ کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے حاکم اور محکوم طبقات میں شخصیت کی تشکیل کے حالات واسباب الگ الگ ہوتے ہیں۔

مثلاً یونان کے غلام دارانہ نظام میں، ممتاز ہستیاں، غلاموں یعنی براہ راست پیدا کرنے والوں کے بالمقابل متوازی پروان چڑھیں۔ غلاموں کا درجہ محض جانوروں اور گھریلو اشیا کے برابر رہا۔

جاگیردارانہ نظام میں، کسانوں کے مقابل میں، متوازی طور پر ''ہیرو'' شخصیتیں تشکیل پاتی رہیں جب کہ کسان محض بھیڑ بکریوں کے گلے کی طرح ہانکے جاتے رہے گویا ظلم، استحصال اور غلامی عوام کو دماغی اور تخلیقی سرگرمی سے الگ کر دیتی ہے اور بحیثیت شخصیت کے، ان کا نشو ونما ست پڑ جاتا ہے۔ شخصیت کی تشکیل میں انسان کی خود آگاہی کی ترقی بھی شامل ہوتی ہے۔ اگر چہ یہ درست نہیں کہ ''شخصیت'' کو گھٹا کر، محض ''خود آگاہی'' میں محصور کر دیا جائے جیسا کہ تصوریت پرستی میں کہا جاتا ہے۔ تاہم فرد کی خود آگاہی کی سطح، اور معاشرے کی جانب اس کی ذمہ داری کا شعور، شخصیت کی حیثیت سے اس کے نشو ونما کا پیمانہ ہے۔

مجموعی طور پر فرد کی خود آگاہی جس حد تک بلند ہوتی ہے۔ اس کا دارمدار تاریخی حالات پر ہوتا ہے۔ مثلاً اجماعتی مراتب کا نظام رکھنے والے معاشرے میں، آدمی ایک جداگانہ شخصیت کی طرح نہیں بلکہ کسی

معین جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے اپنا جتا تا ہے۔

جاگیرداری نظام میں ایک رئیس اپنے آپ کو اس لئے باوقار سمجھتا ہے کہ اس کا تعلق شرفا کی جماعت سے ہے سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ دار کی شخصیت اس کی ملکیت سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔

مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں، معاشرے اور شخصیت کے رشتہ کا تجزیہ کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ معاشرہ، شخصیت اور اس کے حقوق کو برائے نام تسلیم کرتا ہے، یا حقیقت ہیں؟

غلام دارانہ اور جاگیردارانہ نظاموں میں، غلام اور کسان ''شخصیت'' کے حق سے قطعی محروم تھے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں آدمی کا معاشرتی مرتبہ۔ جائداد اور آمدنی کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ

جائداد اور معقول آمدنی سے محروم افراد کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی سرمایہ دارانہ نظام میں، ترقی یافتہ صنعتی پیداوار، ذرائع رسل ورسائل، انسانوں کے درمیان میل ملاپ کے زبردست امکانات، اور رسمی مساوات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شخصیت کی بالیدگی کے لئے، یہ بہت ہی موزوں حالات ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کی تقسیم چاہے کتنی ہی ترقی یافتہ حالت میں ہو، مسخ صورت میں ترقی ہے۔

صنعتی اداروں میں، پیداوار کی مختلف شاخوں کے درمیان خاص ٹیکنیکل تقسیم، شہر اور دیہات کے درمیان محنت کی تقسیم، اور ذہنی اور جسمانی محنت میں تقسیم۔ محنت کی ایسی تقسیمیں ہیں جس سے انسان سرگرمی کے مخصوص شعبے میں ایک معین پیشے کے ساتھ بندھ کر رہ جاتا ہے نتیجتاً اس کی شخصیت یک طرفہ نشوونما پاتی ہے۔ اور مشین کا ماتحت کا حامل ہوجانے کی وجہ سے وہ جزوی مزدور کی حیثیت سے یک پہلو شخصیت کا حامل رہ جاتا ہے۔ اس لئے اپنی امکانی قوتوں اور صلاحیتوں کو پروان نہیں چڑھا سکتا۔

دوسری طرف سرمایہ دار ہے جو محض سرمایہ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے اہم ترین بات سرمائے کا حصول۔ اس کا تحفظ اور فروغ ہوتا ہے۔ اس سے سرمایہ دار کا ذہنی افق اور آرزوئیں بھی مخصوص حلقے میں محدود ہوجاتی ہیں۔

چنانچہ مارکس کا یہ کہنا کہ سرمایہ داری انسان کو اپاہج بنا دیتی ہے۔ اس کی شخصیت کو مسخ اور روح کو پامال کر دیتی ہے اور اسے اشیا کا غلام بنا کر رکھ دیتی ہے غلط نہیں ہے۔ اس لئے کہ سرمایہ دارانہ بورژوا معاشرہ لوگوں میں ٹٹ پونجیا صارف کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ اور ان کی منزل مقصود صرف اشیا کا حاصل

کرنا ہو جاتا ہے۔ ایسے سماج میں اشیا صرف انسانی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ آدمی کے رتبہ کی نشانی اور عزت کا عنصر بن جاتی ہیں اور انسانوں کو ان چیزوں سے ہی ناپا جاتا ہے۔ جن کے وہ مالک ہوتے ہیں۔ تسلیم ظریفی یہ ہے کہ اس صورتحال کو، روزمرّہ کی زندگی میں آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس صورت حال میں جب کہ آدمی کا مقصد صرف اشیا کا حصول بنا جائے۔ اس کے خیالات اور آراء سرمایہ دارانہ اشتہاری پروپیگنڈے کے ذرائع سے ڈھلتی رہتی ہیں۔ سرمایہ دار اجارہ داریاں پروپیگنڈے کے ذرائع کو ''صارف'' پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں اور فرصت کے اوقات میں مصروف رکھنے کے لیے ٹٹ پونجیوں کو کھلونے دیتی رہتی ہیں۔ اس سے اُس کا ذہن گھٹیا عام ثقافت سے بھر جاتا ہے۔ سوچنے کی عادت کم ہو جاتی ہے۔ ذہن کندا اور روح پامال ہو کر رہ جاتے ہیں گویا ''رائٹ ملز'' کے الفاظ میں ایسا شخص محض ''خوش وخرم مشینی انسان'' بن کر رہ جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں، شخصیت کو نشو ونما دینے والی حقیقی ضروریات اور معاشرے کے پورے طریقہ زندگی کے درمیان تضاد پیدا ہو جاتا ہے جسے ''بیگانگی'' (ALIENATION) بھی کہتے ہیں۔ یعنی سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا کرنے والے کی محنت کی پیداوار کو اس سے بیگانہ کر دیا جاتا ہے۔ اس بیگانگی کا سرچشمہ محنت کی تقسیم اور ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ہے۔ بیگانگی کے عمل سے ''غلط کاری کی دنیا'' پیدا ہوتی ہے۔

محنت انسان کی سرگرمی کی بنیادی شکل ہے۔ محنت اور اس کے نتائج میں اس کی صلاحیتیں، علم، تجربہ، اس کی روحانی اور مادی توانائی اور اس کی پوشیدہ قابلیتیں مجسم ہو جاتی ہیں۔

لیکن جب پیدا کرنے والے سے اس کی محنت کی پیداوار بیگانہ کر دی جاتی ہے تو محنت یہ مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اس حالت میں ذریعہ انسان کی تخلیقی صلاحیتیں اور اس کی شخصیت ظاہر نہیں ہو پاتی۔ اور اس طرح انسان معاشرتی قوتوں کے خود رد عمل کا تابع بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر یہ بیگانگی معاشی حلقے سے بڑھ کر سیاسی اور روحانی حلقوں تک وسیع ہو جاتی ہے۔ سیاسی اقتدار معاشرے سے الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ اور محنت کش عوام پر تسلط قائم رکھنا اس کا اصل مقصد ہوتا ہے فوجی اور دفتری مشینری کو جب استحصالی ریاست میں فروغ دیا جاتا ہے تو سیاسی بیگانگی اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

ذہنی محنت کو جسمانی محنت سے الگ کر دینے کا نتیجہ روحانی ثقافت سے اور ثقافت میں تخلیقی سرگرمی

سے عوام کی بیگانگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ پیداوار کی پیدا کرنے والے سے بیگانگی انسان کو انسان سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔ کی صورت میں نکلتا ہے۔

دراصل نجی ملکیت انسانوں کو منقسم کرتی رہتی ہے۔ اور ہر شخص صرف اپنے ہی غرض رکھتا ہے اس سے انفرادیت پرستی کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ سرمایہ داری میں شخصیت اور معاشرہ ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور جب شخصیت معاشرے اور دوسرے انسانوں سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو انسان اپنے آپ کو تنہا، کھویا ہوا، اور رد کیا ہوا محسوس کرتا ہے۔

عوام اور شخصیت

فرد معاشرے کے ارتقا پر کیسے ڈالتا ہے، اس کا تاریخی رول کیا ہے؟ اس سوال کا جواب شخصیت اور عوام الناس کے درمیان تعلق تجزیہ کر کے ہی دیا جا سکتا ہے۔ شخصیت بنیادی طور پر تاریخی عمل میں عوام الناس کے ایک ذرے کی حیثیت سے حصہ لیتی ہے۔ ہر انسان کی سرگرمی کسی نہ کسی طبقے، معاشرے یا قوم کے تحریک یا سرگرمی میں شامل ہوتی ہے جب معاشرہ بدلتا ہے تو طبقات اور گروہ جن پر عوام مشتمل ہوتے ہیں وہ بھی بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک معین معاشرے میں۔ سب سے پہلے محنت کش عوام ہوتے ہیں۔ جو مادی قدریں پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ طبقات او معاشرتی گروہ بھی جو اپنے خارجی رتبے کی وجہ سے مخصوص ملک اور مخصوص دور میں ترقی پسند تاریخی فرائض کو انجام دے سکتے ہیں تاریخ بادشاہوں کے محلوں، صدروں اور وزیروں کے قصروں یا پارلیمنٹ کے ایوانوں میں ترتیب نہیں پاتی۔

یہ تخلیق ہوتی ہے کھیتوں اور کھلیانوں میں، کانوں اور کارخانوں میں، یعنی مادی پیداوار کے میدانوں میں۔ تاریخ کے دھارے پر عوام الناس کا اثر صرف مادی قدریں پیدا کرنے تک محدود نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام معاشرتی تبدیلیوں میں بھی عوام الناس ہی فیصلہ کن قوت ہوتے ہیں۔

رعیت کے بغیر بادشاہ اور سپاہ کے بغیر سپہ سالار کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا معاشرتی سیاسی میدان میں بھی عوام الناس فیصلہ کن قوت ہیں جو انسانی سرگرمی کا دوسرا بنیادی میدان ہے۔

اس طرح روحانی ثقافت کا نشو ونما بھی عوام الناس کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ زبان کے بغیر کوئی بھی روحانی تخلیق نہیں ہوسکتی اور زبان پیداوار ہے عوام کی۔ معاشرتی زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو۔ آپ کو ہر جگہ براہ راست یا بالواسطہ عوام ہی فیصلہ کن رول ادا کرتے نظر آئیں گے۔ ممتاز شخصیت کے رول کا براہ راست انحصار عوام الناس کی سرگرمی پر ہوتا ہے۔ عوام الناس جتنے زیادہ سرگرم ہوتے ہیں، تحریک کے رہنماؤں کی صفات کا اتنا ہی زیادہ سنجیدگی کے ساتھ مطالبہ کیا جاتا ہے۔ نمایاں شخصیتیں صرف اپنے عہد اور طبقے کی ممتاز خصوصیات کا انتہائی واضح اور صاف انعکاس ہوتی ہیں اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنے وقت کی ضروریات کا بدرجہ غایت اظہار کرتی ہیں۔

معاشرتی ترقی کا تصور

انسانی تاریخ پر معاشرتی ترقی کے تصور کے اطلاق کی وجوہات کیا ہیں؟

معاشرتی زندگی میں ترقی کیا ہے۔ اور رجعت کیا ہے؟

جب معاشرتی نظام کی شکلوں میں تبدیلی کا مطلب نچلی حالت سے بلند حالت میں پیش قدمی ہوتا ہے تو اس کو ثابت کرنے کے لیے کیا کوئی خارجی معیار ہے؟ جوھان ھردڑ اور ژین کونورا وغیرہ اٹھارویں صدی کے مفکرین نے، ترقی کی بنیاد انسانی عقل، سائنس اور علم وغیرہ کے فروغ کو قرار دیا تھا۔

ہیگل نے انیسویں صدی میں، انسانی تاریخ کا جدلیاتی تصور پیش کیا جس کی رو سے، تاریخ ''آزادی کے شعور'' کے ارتقاء کا نام ہے۔ لیکن ہیگل کے تصور میں جرمن قوم پرستی کا نشہ بھرا ہوا تھا۔ ہربرٹ اسپنسر اور آگسٹ کومتے بھی معاشرتی ترقی کو مانتے تھے۔

ہر قوم کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم کی تاریخ دہرائے۔ تاہم تاریخ میں عام ممتاز خصوصیات کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ اس عام امتیازی خصوصیات، کی تعریف پیدا آور قوتوں اور تعلقات پیداوار کے تجزیے کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ اس ''عام عنصر'' اور اس کی تبدیلیوں کے تجزیے سے انسانی معاشرے کے ارتقاء کی عام راہ کو واضح کرنے میں مدد ملتی ہے۔ تاریخ میں، وحدت، سے دو سطحوں پر بحث کی جاسکتی ہے۔

پہلے، ہر معین تشکیل کے اندر تمام معاشرتی مظاہر میں وحدت ہوتی ہے ایسی وحدت جو ایک معین طریقہ پیداوار کی بنا پر مظاہر کے درمیان فطری ربط کے وجود سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے، ملکوں، قوتوں، ثقافتوں، ریاستوں کی کثرت میں وحدت تاریخی ارتقاء کی ترقی پذیر راہ کو واضح کرنا اور تاریخ کی راہ کی مجموعی طور پر سمجھنا صرف اسی وقت ممکن ہے، جب تمام عالمی تاریخ اور اس کے اندرونی رابطوں اور تسلسل کو پیش نظر رکھا جائے۔ ایسا محض مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ یورپ، ایشیا، یا افریقہ، تاریخی نہیں، بلکہ جغرافیائی تصورات ہیں۔

اگر ترقی کا مطلب ایک پسندیدہ سمت میں ارتقا ہے، تو پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بعض جسے پسندیدہ سمجھتے ہیں وہی دوسروں کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیداوار معاشرتی ارتقا کی اصل بنیاد ہے اور پس ہمیں معاشرتی ارتقاء کا خارجی معیار، یعنی وہ پیمانہ تلاش کرنا چاہیئے جو ان امتیازات کے خارجی اندازوں کے لیے استعمال کیا جا سکے جو تاریخی عمل کے دوران پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ پیداوار کے ارتقا کے معیار کا تعین پیدا آور قوتوں کی ترقی کی سطح سے ہوتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرتی ترقی کے انتہائی خارجی پیمانے کی جستجو پیدا آور قوتوں کے ارتقاء میں کی جائے۔

انسانیت کی معاشرتی ترقی کی منزلوں میں پیش قدمی کے لیے پیدا آور قوتوں کی نشوونما مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ وہ اس سطح کو ظاہر کرتی ہے جس تک انسان کا فطرت کی قوتوں پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔

پیدا آور قوتیں انسانیت کے معاشرتی ارتقا کے لیے امکانات بھی فراہم کرتی ہیں۔ معیشت پر معاشرے کے سماجی ڈھانچے کا۔ اس کے مختلف معاشرتی اداروں کا اور بالائی ڈھانچے کے پورے حلقے کا انحصار ہوتا ہے۔ اس لئے معاشرتی ڈھانچوں کا بھی خارجی طور پر تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ تعلقات پیداوار کا دارمدار پیدا آور قوتوں پر ہوتا ہے، اس لئے تعلقات پیداوار مختلف ملکوں اور قوتوں کے ارتقا کے عام پہلو واضح کر سکتے ہیں اور تمام معاشرتی ڈھانچے کے اہم عناصر کے خارجی تخمینے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ آدمی ایک معاشرتی ہستی ہے۔ اس کی فطرت ایسی چیز نہیں جو نا قابل تغیر ہو۔ معاشرتی سائنس انسان کے مفادات وضروریات کو تاریخ کی پیداوار تصور کرتی ہے۔ یہ بات معاشرتی ترقی کو معاشرتی انسان کی نشوونما کی طرح دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔

تاریخی ترقی معاشرے کا خود ارتقا ہے جسے معاشرتی قوانین معین کرتے ہیں اور جو انسانی سرگرمی کے وسیلے سے واقع ہوتی ہے۔ تاریخ ترقی کا یہ نقطہ نظر بتایا ہے کہ بذات خود ترقی کی سمت کا دار مدار انسانوں کی مرضی خواہش یا تمنا پر نہیں بلکہ خارجی قوانین کی کارکردگی پر ہوتا ہے۔ اور باشعور معاشرتی مقاصد جنہیں انسان اپنے لیے مقرر کرتے ہیں صرف اس وقت کامیابی کے ساتھ حقیقت کا جامہ پہنتے ہیں جب وہ تاریخی ارتقا کے خارجی رجحانات کے مطابق ہوتے ہیں۔

معاشرتی باضابطگیاں گہرے تاریخی رجحانات کی طرح کارفرما ہوتی ہیں اور اس عام سمت کو معین کرتی ہیں۔ جس کی جانب مخصوص معاشرتی حالات کے اندر تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ لیکن اصل تاریخ میں ان حدود کے اندر جن کا تعین مخصوص تشکیل کے مادی حالات کرتے ہیں۔ حقیقت کا جامہ پہنانے کا دار مدار عوام الناس کی سرگرمی یعنی انسانوں کے تاریخی عمل پر ہوتا ہے اس طرح انسانوں کے سامنے تخلیقی تاریخی عمل کے وسیع ترین امکانات موجود ہوتے ہیں۔ وہ نکات جن کی بنیاد پر ترقی کے وسیع امکانات ہوسکتے ہیں یا اس کے برعکس وہ نکات جن کی بنیاد پر، جمود اور رجعت ابھر سکتی ہے۔ اس انحصار نہ صرف قوانین کا کارفرمائی پر ہے بلکہ کئی عناصر کے باہمی عمل پر بھی ہے۔ پیداوار کے ارتقا کے معین ادوار میں ترقی کی متضاد شکلیں تاریخی لحاظ سے ناگزیر ہوتی ہیں۔ گویا تضاد اور ترقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے معاشرتی ترقی کی متضاد فطرت معاشرتی ارتقا کے انتہائی غیر ہموار اور پرپیچ کردار سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ترقی کبھی بھی سیدھے عمودی خطوط پر نہیں بلکہ پیچیدہ طریقے سے ہوتی ہے، جس میں پسپائی جمودا اور تکرار بھی شامل ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ انسانیت نے اگر ایک میدان میں عروج حاصل کیا تو دوسرے میدان میں تنزل سے دوچار ہوئی۔ معاشرتی ابھار اور انقلاب کی جگہ رجعت پرستی کا زمانہ آ گیا۔ نئے حالات نے نئے مسائل لے کر نئے خطرات کھڑے کر دیے۔ ایک یا دوسرے شعبے میں خود ترقی نے رجعت پرست رجحان اور خواہشات پیدا کیں۔ کبھی کبھی معاشرتی ارتقا میں مشکلات اور تضادات نے لوگوں میں مایوسی اور قنوطیت کا احساس پیدا کیا۔ اور بہتر مستقبل حاصل کرنے کے امکان سے ان کا یقین ہٹا دیا۔

لیکن ایسا صرف معاشرتی تضادات کی بنا پر ہوا کرتا ہے۔ جب تک معاشرہ طبقاتی نظام کا حامل رہے گا۔ اور انفرادی ملکیت کی زنجیروں میں جکڑا رہے گا۔ یہ مایوس کن صورت حال پیش آتی رہے گی۔

غالباً سرمایہ دارانہ نظام تاریخ کی آخری متضاد و معاشرتی تشکیل ہے۔ معاشرہ کا وہ مقام جہاں ہر فرد کی آزاد نشو ونما سب کی آزاد نشو ونما کی شرط بن جائے اور جس معاشرے میں ایک حصہ کی نشو ونما دوسرے حصے کو محروم کرنے والی نہ ہو، ایک مکمل اجتماعی نظام میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ تجربہ دکھاتا ہے کہ یہ ایک انتہائی پیچیدہ فریضہ ہے۔ اس کی پوری تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اول پیدا آور قوتوں، سائنس، ثقافت اور اشتراکی شعور کی سطح بہت بلند ہو، دوسرے مناسب معاشرتی اور معاشی دوائر قائم ہوں۔ معیشت، سائنس اور ثقافت کی تمام حاصلات کا استعمال خود انسان کی ہم آہنگ نشو ونما کے لیے اور فرد کی آزادی کے فروغ کی خاطر ہونا ضروری ہے۔ آج جب کہ دنیا دو مخالف معاشرتی نظاموں میں بٹی ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے سوال پر ہر نظام میں انسانیت کی ترقی کے امکانات پر سخت نظریاتی جدوجہد ہو رہی ہے۔ اور ہر قوم اپنے مختلف تاریخی ارتقا کی سطح اور ثقافتی اور تاریخی روایات کے مطابق اپنے جداگانہ طریقے سے مکمل اجتماعیت کی جانب ہی پیش قدمی کرے گی۔ یہ راستہ پیچیدہ بھی ہے۔ اور کامرانیوں اور شکستوں سے بھرا ہوا بھی ہے۔ یہ سخت جدوجہد کی راہ بھی ہے۔ لیکن انسانیت کے مستقبل یہ ہی ایک راہ ہے۔ جس پر سب کو آنا ہے۔ یہاں انسان تاریخی عمل کے خود در کردار کو زیر کر لے گا اور معاشرتی ارتقا کے قانون کا ادراک اور اس باشعور استعمال پر حاوی ہو جائے گا۔ ذرائع پیداوار کی معاشرتی ملکیت کے قیام اور استحصال کے خاتمے کے ذریعہ، انسان معاشرتی تضادات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے قابل بن جائے گا۔

اس کتاب کو رضیہ سلطانہ نے marxists.org\urdu کے لئے کمپوز کیا۔

☆☆☆☆

پڑھنے والوں سے

marxists.org کا اردو سیکشن آپ کا بہت شکر گزار ہو گا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے مواد اور اس کے ترجمے کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

اپنی رائے کے لئے درج ذیل پتے پر ای میل کریں:

hasan.marxists.org

اس کے علاوہ اگر آپ اردو یا کسی اور زبان کے سیکشن کے لئے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کرنا چاہیں تو انسانی علمی ترقی میں آپ کا حصہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔